فون نمبر: 5863260
5862956
مدیر: چوہدری ریاض احمد
Email: centralanjuman@yahoo.com
رجسٹرڈ ایل نمبر: 8532
قیمت فی پرچہ -/10 روپے

جلد نمبر 97	15 ربیع اوّل تا 15 جمادی اوّل 1431 ہجری - یکم تا 30 اپریل 2010ء	شمارہ نمبر 7-8

احمدیہ انجمن لاہور کی خصوصیات

- آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، نہ نیا نہ پرانا۔
- کوئی کلمہ گو کافر نہیں۔
- قرآن کریم کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں نہ آئندہ ہوگی۔
- سب صحابہ اور آئمہ قابل احترام ہیں۔
- سب مجددوں کا ماننا ضروری ہے۔

تحریک احمدیہ لاہور، فجی کے احمدیہ کنونشن منعقدہ جامع نور، سووا، فجی میں انعقاد کی جھلکیاں

فجی کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے احباب کنونشن کے موقع پر حضرت امیر ایدہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں

حضرت امیر ڈاکٹر عبدالکریم سعید ایدہ اللہ افتتاحی خطاب فرما رہے ہیں

مرکزی احمدیہ انجمن، لاہور نے حال ہی میں ''بیان القرآن'' ترجمہ اور تفسیر حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کا لائبریری ایڈیشن شائع کیا ہے

حضرت امیر ایدہ اللہ امریکہ جماعت کے محترم ڈاکٹر نعمان الہیٰ ملک صاحب کو لائبریری ایڈیشن کا سیٹ پیش کر رہے ہیں

حضرت امیر ایدہ اللہ لائبریری ایڈیشن کے سیٹ محترم محبوب رضا صاحب (سیکرٹری) اور محترم عبدالنسیم صاحب (صدر) فجی احمدیہ انجمن کو پیش کر رہے ہیں

محترم حفیظ اللہ صاحب نمائندہ جماعت نیوزی لینڈ حضرت امیر ایدہ اللہ سے لائبریری ایڈیشن کا سیٹ وصول کر رہے ہیں
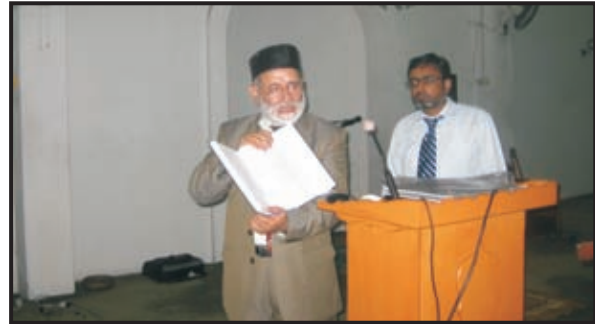
حضرت امیر ایدہ اللہ فجی احمدیہ کنونشن کے موقع پر بیان القرآن لائبریری ایڈیشن کی خصوصیات بیان کر رہے ہیں۔ برادرم عامر عزیز الازہری ان کی دائیں طرف کھڑے ہیں

جماعت احمدیہ قادیان فجی (سووا) میں مقیم مربی سے برادرم عامر عزیز الازہری کی گفتگو کا منظر

نوجوان عبدالہاشم کی تلاوت قرآن مجید سے فجی احمدیہ کنونشن (سووا) کا افتتاح ہوا

تحریک احمدیہ لاہور، فجی (سووا) میں احمدیہ کنونشن کے موقع پر سامعین کا ایک منظر

حضرت امیر ایدہ اللہ وونومینو ہائی سکول، نسوری کے مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات لکھ رہے ہیں۔

اس شمارے میں

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

مشہور برطانوی سیاح اور ہیئت دان مسٹر پروفیسر کلیمنٹ ریگ کی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ سے گفتگو کی تفصیل

(پروفیسر کلیمنٹ ریگ ایک مشہور سیّاح، ہیہت دان اور لیکچرار ہے۔ اور ان کا اصلی وطن انگلستان میں ہے۔ آسٹریلیا میں بہت مدت تک وہ گورنمنٹ کا ملازم افسر صیغہ علم ہیئت رہے۔ سائنس کے ساتھ پروفیسر مذکور کو خاص دلچسپی ہے اور چند کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جب حضرت اقدس لاہور میں تشریف لائے۔ تو پروفیسر اس وقت یہیں تھے۔ اور انہوں نے علم ہیئت پر ایک لیکچر ریلوے اسٹیشن کے قریب دیا تھا۔ اور ساتھ ایک لینٹرن کی روشنی سے اجرام فلکی کی تصویریں دکھائی تھیں۔ یہ لیکچر میں نے بھی سنا تھا۔ دوران لیکچر میں پروفیسر کی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص اندھا دھند عیسائیت کی پیروی کرنے والا نہیں بلکہ غیر متعصب اور انصاف پسند ہے۔ اس واسطے میں ان سے ملا اور حضرت اقدس کے دعوی مسیحیت ومہدویت اور اس کے دلائل سے ان کو خبر کی۔ ان باتوں کو سن کر وہ بہت خوش ہوا اور کہا کہ میں دنیا کے گرد گھوما ہوں اور میں تو ایسے ہی آدمی کی تلاش میں ہوں اور حضرت اقدس کی ملاقات کا از حد شوق ظاہر کیا۔ چنانچہ وہ اور اس کی بیوی دو دفعہ حضرت اقدس کی ملاقات کے واسطے احمدیہ بلڈنگ میں آئے اور علمی سوالات کئے۔ ان میں سے پہلی گفتگو درج ذیل کی جاتی ہے۔ ایڈیٹر)

ابتداء

انگریز: میں اور میری بیوی آپ کی ملاقات کو اپنی لئے موجب فخر سمجھتے ہیں

حضرت: میں آپ کی ملاقات سے بہت خوش ہوں۔

انگریز: میں ایک سیّاح ہوں اور علمی مذاق کا آدمی۔ کائناتِ عالم پر نظر کرتے ہوئے جب میں دیکھتا ہوں کہ زمین وآسمان میں طرح طرح کے عجائبات بھرے پڑے ہیں اور نظام شمسی کا احاطہ اس قدر وسیع ہے کہ عقل چکرا جاتی ہے تو میں یقین نہیں رکھتا کہ ان کا بنانے والا خدا کسی خاص فرقے یا کسی خاص کتاب میں محدود ہو۔ مسلمانوں کا مذہب یہی ہے اور عیسائیوں کا بھی۔ یہودیوں کا بھی۔ میں کسی کی خصوصیت نہیں کرتا۔ میں صداقت کو چاہتا ہوں۔

خدا کسی خاص قوم کا نہیں

حضرت: واقعی یہ بات صحیح نہیں کہ ایک خاص فرقے ایک خاص قوم میں خدا اپنا مقام رکھتا ہو۔ صحیح بات یہی ہے کہ خدا تمام دنیا کا خدا ہے اور جیسا کہ ظاہری اجسام کے لئے سب کی پرورش کرتا ہے اور اس نے انسان کے جسمانی آرام کے لئے اجرام سماوی، ہوا، اناج، پانی وغیرہ اشیاء پیدا کیں۔ ایسا ہی وہ روحانی زندگی کے لئے بھی سامان مہیا کرتا رہتا ہے۔ یہی ہمارا عقیدہ ہے اور یہی قرآن میں لکھا ہے کہ خدا رب العالمین ہے۔ وہ ہر زمانہ میں ہر قوم کی اصلاح کے لئے اپنے پاک بندے بھیجتا رہا ہے اور بھیجتا رہے گا۔ وہ وقتاً فوقتاً اصلاح کرتا رہا اور کرتا رہے گا۔ وان من امة الا خلافیھا نذیر (۳۵: ۲۴)۔ یعنی کوئی بستی اور قوم نہیں جس میں خدا کی طرف سے نذیر نہیں آیا۔ کتابوں میں جو اختلاف ہے۔ وہ درحقیقت اختلاف نہیں بلکہ ہر زمانہ میں قابل اصلاح امور کی اصلاح ہوتی رہی ہے۔ اس کی مثال طبیب کے نسخے سے دی جاتی ہے جوں جوں بیمار کی حالت بدلتی جاتی ہے۔ نسخہ بھی بدلتا جاتا ہے۔ دنیا میں جب اعمال کا فساد بڑھ جائے اور لوگوں کی عملی زندگی بالکل خراب ہوجائے اور اعتقادات میں بھی فساد ہو جائے۔ لوگ خدا کو چھوڑ کر بت پرستی کی طرف مشغول ہوجائیں تو اس کی عزت تقاضا کرتی ہے کہ کسی مصلح کو پیدا کرے۔ اصلاح خدا کے قانونِ قدرت سے باہر نہیں۔ جیسے ہم لوگوں کے لئے وہ ہوا، وہ برسات اور وہ اناج مفید نہیں، جو آدم کے وقت تھا۔ بلکہ تازہ ہوا، تازہ برسات اور تازہ اناج کی ضرورت ہے۔ اور ضرور ہے کہ ہمارے لئے الگ موسمی برسات ہو۔ اسی طرح خدا کی عادت ہے کہ آسمانی سلسلہ کی گذشتہ پرورش ہمارے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی خدا کا منکر ہے تو اس کے لئے بحث کا الگ طرز ہے۔ اگر کوئی خدا کے وجود کا قائل ہے تو ان دو سلسلوں کو مقابل رکھ کر فائدہ حاصل کرے یعنی ایک جسمانی سلسلہ اور ایک روحانی سلسلہ۔ جیسے وہ خدا موسمی برسات وہوا سے جسمانی سلسلے کو تازہ کرتا رہتا ہے اسی طرح روحانی سلسلہ کو روحانی بارش سے۔ اگر جسمانی سلسلے کی پرورش کرنے والی اشیاء اب ناپید ہوجائیں تو وہ سلسلہ نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر کہیں کہ روحانی سلسلے کے لئے جو کچھ تھا۔ (از قسم وحی والہام ونشانات) وہ پیچھے رہ گیا۔ تو روحانی سلسلہ ہی موقوف سمجھو اور یہ ناممکن ہے۔ پس کیا یہ ضروری نہیں کہ زمانہ میں معارف وتازہ حقائق پیدا ہوں۔

انبیاء کا جو سلسلہ چلا آتا ہے اس کو ایک ہی نظر سے رد کر دینا ٹھیک نہیں۔ جو لوگ اپنے پاس ثبوت رکھتے ہیں۔ ان کو معمولی اتنا کہنے سے کہ میں معمولی آدمی ہوں رڈ نہیں کیا جاسکتا ۔ ہاں اگر کسی کا حق ہے تو یہ کہ وہ ثبوت طلب کرے۔ سو ہم بتاتے ہیں کہ ہمارا ثبوت، قصے، کہانیوں پر موقوف نہیں بلکہ سامنے موجود ہے۔ اس وقت موجودہ جو بڑے سے بڑا ہیئت دان نظام شمسی پر نظر ڈالنے سے مصنف مزاج ہوگا، تو یہ کہے گا کہ کوئی اس کا صانع ہونا چاہیے مگر کہ نبی یہ بتاتا ہے کہ واقعی ''خدا'' ہے۔

دنیا کب سے ہے

انگریز: یہ ایک چھوٹی سی زمین ہے میں یقین کرتا ہوں اور بھی کئی زمینیں ہیں اور بھی کئی سلسلے ہیں۔ مجھے یہ عقیدہ غلط معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند ہزار برس سے دنیا کی پیدائش شروع ہوئی۔ اور خدا نے آدم وحوا کو پیدا کیا۔ پھر ایک پھل کھانے سے ان کی سب اولاد گنہگار ہوگئی۔

حضرت: ہم کب کہتے ہیں کہ صرف یہی زمین ہے جس میں خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ عدم علم سے عدم شے لازم نہیں آتا۔ نہ کسی اور ستارے وغیرہ میں آبادی ہے اور ایسی مخلوق اس میں ہے جو نبوت کی محتاج ہو۔ تو خدا نے وہاں بھی ضرور نبی پیدا کئے۔ دوسرا عقیدہ بھی غلط ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ الا تزر وازرۃ اخری (۵۳ : ۳۸) یعنی کوئی کسی کے لئے گنہگار نہیں ہوسکتا۔ ہمارا ہرگز یہ مذہب نہیں کہ اس چھوٹی سی زمین میں جو کچھ ہے بس اسی پر ہے اور اسی کے لئے سب سلسلہ ہے۔

حقیقتِ گناہ

انگریز: دو باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ گناہ کس چیز کو کہتے ہیں۔ ایک ملک کا آدمی ایک چیز کو گناہ قرار دیتا ہے۔ جبکہ دوسرا اس کو عین ثواب۔ علمی طور سے مانا جاتا ہے کہ انسان کیڑے سے ترقی کرتا کرتا اس حد تک پہنچا ہے اور آخر میں اس کے لئے یہ امتیاز پیدا ہوگیا۔ اس امتیاز کے ذریعے سے ایک کو اچھا اور ایک کو بُرا کہتا ہے۔

دوم۔ شیطان کیا چیز ہے اور خدا ایسا وسیع علم والا قادر ہو کر کیوں اجازت دیتا ہے کہ شیطان اپنی بدی پھیلائے۔

حضرت: جو لوگ خدا کی ہستی کو مانتے ہیں ان کے مذاق پر ہم گفتگو کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک قسم کی دائمی زندگی رکھتا ہے۔ تمام قسم کی راحت وخوشحالی کا سرچشمہ خدا ہے۔ جو شخص اس کو چھوڑتا ہے وہ خدا کے پیار کو چھوڑتا ہے۔ اس حالت میں اسے کہا جاتا ہے کہ اس نے گناہ کیا۔ پھر خدا نے محض انسانوں کی فطرت پر نظر کر کے جو اعمال ان کے حق میں مضر پڑتے ہیں۔ ان کا نام گناہ رکھ دیا۔ ان میں سے بعض مناہی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نہی کی حکمت تک انسان نہ پہنچ سکے۔ جو شخص چوری کرتا ہے وہ بیشک دوسرے کا نقصان کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اپنی پاک زندگی کا بھی نقصان کرتا ہے۔ اسی طرح جو زنا کرتا ہے وہ بھی دوسرے کے حق میں دست اندازی کرنے کے علاوہ اپنا نقصان بھی کر لیتا ہے۔ پس جس قدر باتیں انسانی پاکیزگی کے خلاف ہیں جن سے انسان خدا سے دور ہو جائے، وہ گناہ ہے۔ بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو عام سمجھ میں نہ آسکیں۔ مگر یقین رکھو کہ خدا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ علم والا ہے۔ وہ انسان کے لئے وہی بات تجویز کرتا ہے جو اس کی فطرت کے لئے بہت ضروری ہو۔ جیسے ڈاکٹر بیمار کے لئے کچھ تجویز کرتا ہے۔ اب بیمار اس پر اعتراض کرے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ بیمار کو تو ڈاکٹر کا مشکور ہونا چاہیے۔ اگر اللہ تعالیٰ دکھ میں ڈالنے والی مضر اشیاء کی نسبت نہ بتاتا تو اِس کا اختیار تھا۔ مگر وہ رب العالمین ہے اس لئے اس نے بتا دیا۔ جیسے بیماروں کے لئے پرہیز کو توڑنا گناہ ہے۔ اسی طرح روحانی سلسلہ میں بعض پرہیز ہیں جن پر کاربند رہنا خود اسی کے لئے مفید ہے ۔ خوب یاد رکھو کہ انسان کی سچی پاکیزگی اور سچی راحت اور آرام کا موجب خدا کی محبت اور اس کا وصال ہے۔ جن باتوں کو خدا اپنے تقدس کی وجہ سے نہیں چاہتا، ان کا نہ چھوڑنا گناہ ہے۔ پھر یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ گناہ والی چیزوں کو تقریباً تمام قومیں گناہ مانتی ہیں۔ مثلاً سب مذاہب میں چوری، جھوٹ، زنا گناہ ہے۔ اور سب کو تسلیم ہے کہ یہ اللہ کے تقدس کے خلاف اور انسانی فطرت کے لئے مضر ہیں۔ پھر ہر ایک شخص اپنے گناہ کو محسوس کر لیتا ہے۔ ایک شخص کسی کے بچہ کو مارے تو وہ محسوس کر لیتا ہے کہ میں نے برا کیا۔ بھوکے کو کھانا دے تو سمجھتا ہے کہ نیکی کی۔ پس گناہ کی پہچان مشکل نہیں اور نہ ہی اس کی نسبت قوموں میں کوئی ایسا اختلاف ہے۔ شیطان کے بارے میں جیسے کہ میں نے کئی مرتبہ بیان کیا، انسان کی سرشت میں دو قوتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک قوت نیکی کی طرف کھینچتی ہے اور دوسری بدی کی تحریک کرتی رہتی ہے۔ یہ اس لئے تا اس آزمائش میں پڑ کر پاس ہو اور بدی سے رکنے کا ثواب پائے اور الٰہی اطاعت کا انعام حاصل کرے۔ دوسرے لفظوں میں اس بدی کے محرک کو شیطان کہہ لو۔ ہم اکیلے شیطان کے قائل نہیں بلکہ ہم تو شیطان کے ساتھ فرشتہ کے بھی قائل ہیں۔ ہم ان باتوں کے قائل نہیں۔ جیسے عیسائی کہتے ہیں بلکہ ہم داعی خیر کو فرشتہ اور داعی شر کو شیطان سے تعبیر کرتے ہیں۔

گناہ کے وجود کا باعث

انگریز: گناہ کا وجود ہی کیوں ہے؟

حضرت: خدا کسی بدی کا ارادہ نہیں کرتا نہ ہی وہ بدی پر راضی ہے۔ مگر اس

نے انسان کو نیکی و بدی کا اختیار دیا تا نیکی پر ثواب کا مستحق ہو۔ کیونکہ اگر دنیا میں گناہ کا وجود نہ ہوتا تو خیر کا بھی نہ ہوتا۔ اس بات کو خوب سمجھ لو کہ گناہ نہ ہو تو خیر بھی نہ ہو۔ نیکی کیا ہے؟ یہی کہ اگر چوری کا موقع ہو، تو چوری نہ کرے۔ زنا کا موقع ہو تو زنا نہ کرے۔ ایسا دیکھو چوری و زنا کا وجود تھا۔ جب ہی تو اس سے رکنے کا نام نیکی ہوا۔ پس بدی کے پیدا کرنے میں یہی حکمت تھی۔ دراصل یہ بدی ہی نیکی کی خدمت میں لگی ہے۔ دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کو مانتا اور اسے علیم وحکیم جانتا ہے، اسے اس کے فعلوں پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مثلاً کوئی شخص پوچھے۔ سورج اس طرف کیوں جاتا ہے، اس طرف کیوں نہیں جاتا۔ تو یہ غلط ہے

اس کے بعد پھر زیادہ تشریح کے طور پر فرمایا۔ ایک شخص چیخنے کے سوا نہیں بول سکتا۔ جو کسی کو پسند نہیں ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کی آواز ہی نرم ہے۔ تو اب نرم آواز کا ثواب پہلے ہی کو ملے گا۔ انسان اگر ایک ہی حالت رکھتا بدل ہی نہ سکتا تو اس کے لئے کوئی کام نیکی ہو ہی نہ سکتا۔ اصل میں افراط وتفریط کی حالت ہی نیکی بتاتی ہے ۔ پھر چونکہ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ ہر طرف ہر پہلو میں ترقی کر سکتا ہے۔ اس لئے دراصل بدی نیکی بنانے میں مدد دے رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بدی کی طاقت انسان میں نہ ہوتی تو نیکی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ مثلاً پرندے وہ ایک ہی طرز پر ہیں۔ اب ان کا کوئی کام نیکی کا نہیں سمجھا جاتا۔ جیسا کہ بدی کو نہیں سمجھتے ۔ انسان میں اگر اخلاق ذمیمہ نہ ہوتے تو کس طرح اس کے خلاف کو اخلاق حمیدہ کہتے۔ جب ہم کہتے ہیں فلاں نیک ہے تو بدی کا تصور اس کے ساتھ ضروری ہے یعنی فلاں بدی کے خلاف اس میں اخلاق ہیں۔ اگر ایک ہی پہلو پر انسان کو پیدا کیا جاتا تو دوسرے پہلو پر ثواب یا عتاب نہ ہوتا۔ اللہ نے ہر انسان کو دونوں پہلوؤں پر قادر کیا ہے۔ جب ہی تو نیکی کی طرف جانے سے انعام ملتا ہے کیونکہ اس نے نیکی کی۔ مگر اس نیکی کا وجود جب ہی ہوا کہ پہلے اس میں انتقام کی قوت تھی۔ اگر کسی کے ہاتھ نہیں اور وہ کہے کہ میں نے فلاں بے گناہ کو نہیں مارا۔ تو یہ نیکی نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے کوئی انکار کر سکے۔ کیونکہ بدیہات مشہودہ کا انکار نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک قوت جو انسان کو دی گئی ہے۔ وہ بذاتہٖ بری نہیں بلکہ اس کا بد استعمال (خلاف موقعہ ومحل) اس سے بدی پیدا کراتا ہے۔

اتنا سن چکنے کے بعد انگریز کے دل میں ایک سائنس کا مسئلہ پیدا ہوا۔ کہ دنیا میں دو طاقتیں ہیں۔ مثبت اور منفی ۔ مثبت کو استعمال کرتے جائیں تو منفی بڑھتی جائے گی۔ اسی طرح اگر ہم نیکی کو استعمال کریں گے تو بدی بڑھ کر دنیا کو تباہ کر دے گی۔

اس پر اسے سمجھا دیا گیا کہ اللہ اور انسان کے درمیان ایک خاص تعلق ہے۔ انسان اللہ کو ملنا چاہتا ہے اس میں جدائی ڈالنے والی چیز گناہ ہے۔ جوں جوں تعلق بڑھتا جاتا ہے، وہ قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر جھٹ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

نجات عیسوی

انگریز: میرے دو سوال ہیں ۔ا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ شیطان سے دنیا گمراہ ہو گئی۔ خدا نے پھر دوبارہ آ کر اسے سیدھی راہ پر چلایا۔

حضرت: ہم تو اس کو لغو سمجھتے ہیں۔ جو اس کے قائل ہیں ان سے پوچھا جائے۔

ترقی ہے یا تنزل

انگریز: دنیا کے عام نظارہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ادنے سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی کر رہا ہے۔ مگر عیسائی کہتے ہیں کہ انسان اعلیٰ سے ادنےٰ حالت کو پہنچا۔ پہلے اس نے آدم کو پیدا کیا اور وہ گناہ سے ادنیٰ حالت کو پہنچا۔

حضرت: ہمارا عیسائیوں سا عقیدہ نہیں بلکہ ہم اپنے قول کی تصدیق کرتے ہیں۔ آدم کو جو جنت سے اتارا گیا تو یہ اس کے کمالات کے اظہار اور ان کو بڑھانے کے لئے تھا۔

حیات بعد الموت

انگریز: میں آئندہ زندگی کے متعلق آپ کے خیالات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت: جب اس زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو ایک نئی زندگی نئے لوازم کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اگلی زندگی اسی زندگی کا ظل واثر ہے۔ جنہوں نے اچھی تخم ریزی کی وہ وہاں اپنے لئے اچھے پھل پائیں گے۔ جنہوں نے بری تخم ریزی کی وہ پھل بھی برا پائیں گے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ زندگی کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی مثال عالم خواب سی ہے۔ جس وقت انسان سوجاتا ہے۔ معاً اس زندگی میں ایک انقلاب آ جاتا ہے پہلی زندگی کا نام نہیں رہتا۔ ہم اس مختصر وقت میں زیادہ تفصیل نہیں دے سکتے۔

روحوں سے ملاقات

اس کے بعد میم صاحبہ نے کچھ پوچھنا چاہا۔ اجازت پر اس نے عرض کیا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ جو لوگ اس دنیا سے گذر چکے ہیں ان سے ہم صحیح پیام واطلاع حاصل کر سکیں؟

حضرت نے فرمایا: کہ انسان کشفی طور سے گذشتہ روحوں سے مل سکتا ہے مگر اس کے لئے یہ ضروری امر ہے کہ روحانی مجاہدات کئے جاویں۔ بے شک ان سے

مفید مطلب باتیں دریافت کرسکتا ہے مگر اس کے لئے بہت سے مجاہدات کی ضرورت ہے جو اس زمانہ کے لوگوں سے نہیں ہو سکتے۔ جبھی وہ ایسی باتوں سے انکار کرتے ہیں۔ میرا مذہب ہے کہ وہ خواب میں نہیں بلکہ بیداری میں مُردوں سے مل سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی۔ ایسا ہی اور اہل قبور سے میں نے ملاقات کی۔

یہ بات تو سچ ہے مگر ہر ایک کے لئے میسر نہیں۔ انسان کے قلب کی حالت کچھ ایسی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے عجائبات ڈال رکھے ہیں۔ جیسے کنویں کو کھودا جائے تو آخر بہت سی محنت کے بعد مصفا پانی نکل آتا ہے۔ اسی طرح جب تک مجاہدہ پورے طور سے انتہا تک نہ پہنچے، صحیح وصاف خبر حاصل نہیں ہوسکتی۔

پروفیسر ریگ کی دوبارہ ملاقات

پہلی ملاقات سے پروفیسر صاحب کی اس قدر تشفی ہوئی اور ان کے سوالات پر جو جواب حضرت اقدس نے دئے ان سے وہ اس قدر خوش ہوئے کہ اس نے بہت الحاح کے ساتھ درخواست کی کہ انہیں ایک دفعہ پھر حضرت اقدس کی ملاقات کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ حضرت اقدس کے حکم سے ان کو اجازت دی گئی کہ پیر کے دن تین بجے وہ آئے۔ ٹھیک وقت پر پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی حضرت کی ملاقات کے واسطے آئے۔ ان کے ساتھ ان کا چھوٹا لڑکا بھی تھا۔ اس دلچسپ مکالمہ کی رپورٹ درج ذیل ہے:

مکالمہ اول کے وقت حضرت مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے ترجمان تھے اور اس دفعہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بی۔اے ترجمان بنے۔
معمول مزاج پرسی کے بعد سلسلہ کلام یوں شروع ہوا۔

ذات وصفات اللہ تعالیٰ

پروفیسر: آیا آپ خدا کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی شخصیت رکھتا ہے اور اس میں جذبات ہیں یا ایسا خدا ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔

حضرت: ہم اللہ تعالیٰ کو لامحدود سمجھتے ہیں۔ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ ہم اس کی نسبت یہی سمجھتے ہیں کہ جیسا وہ آسمان پر ہے ویسا ہی وہ زمین پر بھی ہے۔ اور اس کے دو قسم کے تعلق پائے جاتے ہیں۔ ایک اس کا عام تعلق جو کل مخلوقات سے ہے۔ دوسرا وہ تعلق اس کا جو خاص بندوں کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنے نفس کو پاک کر کے اس کی محبت میں ترقی کرتے ہیں۔ تب وہ ان سے ایسا قریب ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ ان کے اندر ہی سے بولتا ہے۔ یہ اس میں ایک عجیب بات ہے کہ باوجود دور ہونے کے نزدیک ہے اور باوجود نزدیک ہونے کے وہ دور ہے۔ وہ بہت ہی قریب ہے، مگر پھر بھی یہ نہیں کہہ سکتے۔ جس طرح ایک جسم دوسرے سے قریب ہوتا ہے۔ اور وہ سب سے اوپر ہے مگر نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس کے نیچے کوئی اور چیز بھی ہے۔ وہ سب چیزوں سے زیادہ ظاہر ہے مگر پھر بھی وہ عمیق در عمیق ہے۔ جس قدر انسان سچی پاکیزگی حاصل کرتا ہے اس قدر اس وجود پر اطلاع ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ جو نہایت درجہ قدوس ہے اپنی تقدس کی وجہ سے ناپاکی کو پسند نہیں کرتا۔ چونکہ وہ رحیم وکریم ہے اس لئے نہیں چاہتا کہ انسان ایسی راہوں پر چلیں جن راہوں میں ان کی ہلاکت ہے۔ پس یہ صفات (جس کے لئے جذبات کا لفظ بولا گیا ہے) ہیں۔ جن کی بناء پر یہ مذہب کا سلسلہ جاری ہے۔

کیا خدا محبّ ہے

پروفیسر: اگر خدا بالکل محبت اور انصاف ہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک مخلوق کا گذارہ دوسرے کی ہلاکت پر ہے۔ ایک چڑیا کو باز کھالیتا ہے۔ پس کیوں باز میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے کہ وہ دوسرے کو کھالے، جو اس کی محبت اور انصاف کا تقاضا نہیں ہوسکتا۔

حضرت: جب محبت کا لفظ بولا جاتا ہے کہ خدا محبت ہے تو وہ لوگ غلطی کرتے ہیں جو خدا میں ہی محبت کا وہی مفہوم سمجھتے ہیں جو انسان میں سمجھتے ہیں۔ یاد رکھو کہ انسان میں جو کچھ محبت یا غضب ہے اسی طرح کی محبت یا غضب خدا کی طرف منسوب نہیں کرسکتے۔ انسان جو کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کے فراق سے اسے صدمہ پہنچتا ہے۔ ماں بچے سے محبت کرتی ہے۔ اگر بچہ مر جائے تو اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ کسی کا محبوب جدا ہو جائے تو اس کے فراق میں تڑپتا ہے۔ پس کیا خدا کو بھی تکلیف پہنچتی ہے ہرگز نہیں۔

پس خدا پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جیسے کسی پر غضب آتا ہے وہ خود ہی ایک قسم کی سزا پالیتا ہے اس کے اندر سوزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ راحت وآرام جس میں تھا، جاتا رہا۔ اس لئے ہم ان لفظوں کو ان معنوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے۔ یہ ان لوگوں کا کلام ہے جو انسان کی حالت پر قیاس کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنی ذات میں بے مثل ہے پس ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ جو اس کی رضا کے مطابق چلتا ہے اس پر وہ خوش ہے اور یہ لفظ جو ہیں کہ خدا محبت ہے ہم نہیں استعمال کرتے نہ یہ استعمال کے لائق ہیں کیونکہ محبت کا لفظ سوز وگداز رکھتا ہے۔ غضب کرنے والا بھی تکلیف میں آتا ہے۔ اشتعال دکھ پہنچاتا ہے۔ پس ہم ایسے ناقص لفظ معنوں کے

ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ (یہاں یہ حکیم الامت (حضرت مولانا نورالدین ناقل) کا فرمودہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خدا تعالیٰ کے اسماء جن میں محبّ اور اغاصب کا لفظ نہیں۔ یعنی بطور اسم فاعل وصفت مشتبہ نہیں۔ ہاں فعلی رنگ میں ہے۔ **واللہ یحب المتقین**۔

پروفیسر نے اس پر زیادہ تشریح چاہی کہ اعلیٰ طبقہ کا جانور ادنےٰ کو کیوں کھاتا ہے۔

حضرت: میں نے اسی بنا پر کہہ دیا ہے کہ جو اس کا رحم ہے یا غضب۔ ہم اس کی ایسی تشریح نہیں کر سکتے، جیسا انسانوں کے متعلق کرتے ہیں۔ اس کا وسیع نظام پراز حکمت ہے۔ اسکے نظام میں حد سے زیادہ دست اندازی نہیں کر سکتے۔ انسان اس کے دقیق مصالح میں دخل دے تو یہ بات اچھا نتیجہ لانے والی نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ادنے طبقے کے جانوروں کے لئے اگر تکالیف کا حصّہ ہے تو ادنےٰ کے لئے بھی ہے۔ یہ عالم مختصر اور فانی ہے۔ بعد اس کے ایک وسیع عالم ہے۔ جسمیں اللہ نے ارادہ کیا ہے کہ ہر ایک قسم کی خوشحالی دی جائے۔ پس جو یہاں دکھ اٹھائے گا وہ اگلے جہاں میں اس کا عوض پائے گا۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اعلیٰ درجے والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ تکلیف سے وہ بھی خالی نہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مگر شیر اور قسم قسم کے درندے اسے کھا جاتے ہیں۔ پس کوئی دکھ سے خالی نہیں۔ کسی کو کسی رنگ میں تکلیف ہے کسی کو کسی میں۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ کیوں ایک خاص گروہ کو تکلیف میں رکھا گیا۔ کیونکہ تمام مخلوقات کسی نہ کسی طرح دکھ اٹھا رہی ہے۔ چڑیا کو کھانے کے لئے باز ہے۔ تو باز کے لئے کوئی اور قسم کی تکلیف ہے۔ انسان اگر حیوان کو ذبح کرتا ہے تو اس کے لئے اور قسم کی تکلیف ہوگی۔ پس ان دکھوں کے تدارک و تلافی کے لئے دوسرا جہاں ہے۔ اس عالم کے بعد جب دوسرا عالم آئے گا تو اس کی تلافی ہوگی۔ دنیا دارالامتحان ہے۔ اگر کوئی سوال پوچھے کہ ایسا کیوں؟ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ وہ مالک ہے اور مالک کو سب اختیار ہے۔

تکلیفیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ انسان کو کئی تکلیفوں سے متکلّف کیا گیا ہے۔ خدا کی راہ میں مجاہدہ، مشقتِ سفر، جان دینا۔ اب حیوانوں کو یہ تکلیفیں کہاں ہیں۔ انسان تو دوہری تکلیفیں اٹھاتا ہے۔ ایک قضا و قدر کی تکلیفیں اور دوسری شرعی تکالیف۔

پھر دیکھو کہ انسان کے حواس میں تیزی بہت ہے۔ وہ دکھ کو جلدی محسوس کرتا ہے۔ حیوانات میں یہ احساس کم ہے۔ جیسے خدا نے حیوانات کو عقل نہیں دی۔ ویسا ہی انہیں مستی کی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ وہ جو ذبح کے وقت تڑپتا ہے تو یہ جسمانی خواص کا تقاضا ہے۔ احساس مصائب تو دراصل صرف انسان کے لئے ہے جس کے دماغی قویٰ بہت زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ دیکھو مجھے حس کا مرض ہے۔ مجھے کوئی انگلی بھی لگا دے تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ پس یہ نہ سمجھو کہ دکھ صرف ایک خاص طبقے کے لئے ہیں بلکہ سب کے لئے ہیں۔ اس لئے خدا کے انصاف پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

پروفیسر: جس طرح آپ نے فرمایا ہے ان تکالیف کا عوض ملے گا۔ کیا ادنیٰ جانوروں کو بھی ملے گا۔

حضرت: ہاں ہم یقین کرتے ہیں کہ سب کو ملے گا۔

پروفیسر: اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ادنیٰ درجے کے حیوانوں کی روح بھی مرنے کے بعد باقی رہیں گی۔

حضرت: ہاں کیوں نہ رہیں گی۔

انسان کب سے ہے

پروفیسر: آدم حوا جیھون اور سیھون ادنےٰ کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ کیا امریکہ والے بھی اسی آدم کی اولاد ہیں جیسا کہ مشہور ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ ایک آدم کی سب اولاد ہیں۔

حضرت: ہم اس بات کے قائل نہیں کہ ایک ہی آدم تھے۔ کئی آدم تھے۔ **انی جاعل فی الارض خلیفة** ۔(۲:۳۰) سے بھی یہی ظاہر ہے کہ آدم کسی کا جانشین نہیں۔ ہم تو اس کی پیروی نہیں کرتے کہ اس سے پہلے کچھ نہ تھا۔ جو کچھ ہے اس آدم سے ہے۔ اور نہ ہم اس بات کے قائل ہو سکتے ہیں کہ یہ زمانہ چند ہزار برس سے ہے بلکہ پہلے سے یہ سلسلہ چلا آتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امریکہ والے اسی آدم کی اولاد ہیں۔ محی الدین ابن عربی لکھتے ہیں کہ میں حج کو گیا کشف میں دریافت کیا کیا یہ آدم ہے۔ جواب ملا۔ تو کس آدم کی تلاش کرتا ہے ہزاروں آدم گذر چکے ہیں۔

ڈارون کی تھیوری

پروفیسر: آیا حضور مسئلہ ارتقاء کے قائل ہیں اور اگر یہ مانتے ہیں تو پھر روح کب پیدا ہوئی؟

حضرت: ہمارا مذہب یہ نہیں کہ انسان کسی وقت بندر تھا پھر دم کٹ گئی اور انسان بن گیا۔ یہ تو صرف دعویٰ ہے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے۔ ہم قائل ہو سکتے ہیں اگر کوئی ایسا بندر پیش کیا جائے جو رفتہ رفتہ انسان بن گیا ہو۔ ہم ایسے قصّوں پر اپنے ایمان کی بنیاد نہیں رکھ سکتے۔ موجودہ زمانہ کا عام نظارہ جو ہے وہ یہی ہے کہ بندر سے بندر پیدا ہوتا ہے اور انسان سے انسان۔ پس جو اس کے خلاف کہے وہ قصّہ ہے۔ واقعی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ انسان ہی سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اور پہلے دن آدم

ہی بنا تھا۔روح کے متعلق ہمارا یہ مذہب ہے کہ وہ ایک مخلوق چیز ہے جو اسی عنصری مادہ سے پیدا ہوتی ہے۔اس کے نظائر ہم نے ''چشمہ معرفت'' میں دے دیئے ہیں۔یہی قرآن شریف کی تعلیم ہے۔اور یہ ڈاکٹری تشریحوں سے معلوم ہوتا ہے۔وہی نطفہ جو ہوتا ہے اس میں روح ہوتی ہے۔وہ نشو ونما ترقی پاتی بڑی ہو جاتی ہے۔جب ہی تو فرمایا۔ثم انشانا ہ خلقا آخر ۔(۱۴:۲۳) یہ بات بالکل صحیح نہیں کہ روح ابتداء سے چلی آتی ہے۔اسی طرح خدا تعالیٰ کی حکمت پر بہت سے اعتراض ہوتے جاتے ہیں۔پس ہم کسی ثابت شدہ سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔

اسلام سائنس کے مطابق

پروفیسر: مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ کا مذہب سائنس کے مطابق ہے۔

حضرت: اسی لئے تو خدا نے ہمیں بھیجا تا ہم دنیا پر ظاہر کریں کہ مذہب کی کوئی بات سچی و ثابت شدہ حقیقت سائنس کے خلاف نہیں۔

تاثیر اجرام سماوی

پروفیسر: امریکہ میں روحانیت والے ہیں۔ان کی رائے ہے کہ جو زندگی ہے وہ چاند سے اتری ہے۔چاند جو پیدا ہوا ہے زمین سے، زمین میں زندگی کی کیفیت تھی۔آپ کی کیا رائے ہے اور وہ کہتے ہیں عقل مشتری نے دی۔

حضرت: زندگی اور قویٰ کا سرچشمہ تو باری تعالیٰ ہے۔اس نے سورج چاند اور دیگر اجرام سماوی کو انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے۔وہ جب پیٹ میں تیار ہوتا ہے تو اجرام سماوی کی تاثیرات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔سبعہ سیارہ کا اثر یہی ہے۔یہ تاثیرات ہماری شریعت کے مخالف نہیں۔لیکن ہم ایسی بات کو جو ثابت شدہ نہ ہو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ہاں یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی ترتیب میں اجرام سماوی کا حصّہ بھی ہے۔جیسے کہ چاند کی روشنی سے پھل پکتے ہیں۔اور انار کے پکنے اور پھوٹنے کی آواز بھی نکلتی ہے۔

روح کے اقسام

پروفیسر: کیا جو کچھ مکھیوں میں اور دوسرے پرندوں میں ہے اس کا نام بھی روح ہے۔

حضرت: روح تین قسم کی ہے۔روح نباتی۔حیوانی۔انسانی۔حقیقی کمالات کی جامع حقیقی زندگی کی وارث انسان کی روح ہے۔یہ حیوانات کی روح اس سے کم درجہ، نباتات کی اس سے کم۔نباتات میں بھی ایک قسم کا احساس ہوتا ہے۔ایک بوٹا ہے جب کسی گھر میں لگایا جائے جب چھت کے قریب آ جاتا ہے۔تو وہ اپنا رخ کسی اور طرف پھیر لیتا ہے۔چھوٹی موٹی ایک بوٹی ہے۔اس میں بھی شعور ہے۔اب اس سے زیادہ ان معاملات میں پڑنا اور کہ حقیقت میں پہنچنے کی کوشش فضول ہے۔

تو کار زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

انسان قابل عفو

پروفیسر: جب ہم ایمان رکھتے ہیں کہ انسان خدا کی طرف سے ہے۔مگر وہ نیکی کی طرف جاتا ہے۔تو کیا اس کی غلطیاں قابل معافی نہیں؟ کیا یہ عقیدہ صحیح ہے کہ انسان بغیر اس کے نجات نہ پائے گا۔جب تک اس کے لئے ایک کفارہ نہ ہو۔

حضرت: یہ عقیدہ بالکل نہیں ہے۔انسان اپنے اعمال صالحہ سے خدا کے فضل کو جذب کرتا ہے اور اس فضل پر اس کی نجات ہے۔دنیا میں دیکھ لو کہ انسان تخم ریزی کرتا ہے۔پھر اس پر محنت کرتا ہے۔آخر اس کا نتیجہ پاتا ہے۔کسی کفارہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔اسی طرح الدنیا مزرعة الاخرة جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اس کی رحمت سب پر عام ہے۔

پروفیسر: واقعی یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انسان لاکھ نیکی کرے پھر بھی اس کی نیکی رائیگاں جائے جب تک کفارہ پر ایمان نہ لائے۔

اس کے بعد اس نے مع اپنی میم کے کھڑے ہو کر شکریہ ادا کیا۔اور اس امر کا اظہار کیا کہ مجھے اپنے سوالات کا جواب کافی اور تسلی بخش ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔اور مجھے ہر طرح سے کامل اطمینان ہو گیا۔اور یہ اطمینان دلانا خدا کے نبی کے سوا کسی میں نہیں۔

(اخبار ''بدر'' مورخہ 26 مئی 1908ء ص ص 1-6)

☆☆☆☆

انگریزی سے ترجمہ: فائزہ عرفان علی (ایم ایس ایڈ)

آخری قسط

جہاد کے بارے میں ممتاز مفکرین کی آراء

ڈاکٹر زاہد عزیز، ایم ایس سی، پی ایچ ڈی (انگلستان)

۸۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر

ڈاکٹر گوٹلپ ولھم لائٹنر صاحب جن کا انتقال 1899ء میں ہوا ایک انتہائی تعلیم یافتہ زبان دان، عربی اور اسلام کے ایک مستند عالم تھے۔ خاندانی لحاظ سے وہ یہودی نژاد تھے۔ لیکن ایک روایت کے مطابق بالآخر انہوں نے اسلام قبول کیا اور ان کا نام عبدالرشید تھا۔ گوان کا اسلام کے بارے میں تحقیقی کام، مضامین اور پھر پنجاب اور دیگر مقامات پر مسلمانوں کے لئے ان کی تعلیمی خدمات ان کی زندگی کے کارناموں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے اسلام قبول کرنے کی مستند ذرائع سے تصدیق ابھی تک نہیں ہوسکی۔ 1899ء میں آپ ووکنگ، سرے انگلستان میں شاہجہان مسجد کے بنانے کی حیثیت سے انتہائی معروف اور مشہور تھے۔ انہوں نے اپنے رسالہ ''ایشیاٹک کواٹرلی ریویو'' جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا اس کے اکتوبر 1886ء کے شمارے میں ''جہاد'' کے بارے میں بالکل ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا جن کا ذکر گذشتہ آراء میں ہو چکا ہے۔ بعض خیالات کو دہرانے کی بجائے ذیل میں صرف ان باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو انہوں نے دوسروں سے ذرا ہٹ کر کہی ہیں:

''جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''جہاد'' کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ غیر مسلموں کے ملکوں کی حکومت یا ملک کے خلاف جنگ کریں اور اس کو جہاد کا نام دینا (گو یہ تو ممکن ہے کہ بعض حالات میں اس لفظ کو استعمال کرنا جائز ہے) لیکن ایسا کرنا انتہائی بے ہودہ بات ہے اور اس مذہب کے متعلق ایسا الزام ہے جو ناجائز ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اس مذہب سے بالکل ناواقف ہیں۔

''جب کچھ لوگوں نے محمدؐ سے اجازت چاہی کہ وہ جہاد میں شریک ہوں جو ان لوگوں کے خلاف تھی جو مسلمانوں پر ظلم و تشدد کر رہے تھے۔ تو انہوںؐ نے جواب دیا: ''آپ کا جہاد اپنے والدین کی خدمت کرنے کے لئے پوری کوشش کرنا ہے''۔ قرآن مجید جب جہاد کا لفظ استعمال کرتا ہے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ گناہ یا برائی کے خلاف جنگ کو فوقیت دیتا ہے جیسے فرمایا: ''اور جو لوگ ہمارے لئے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائینگے اور اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے'' (۶۹:۲۹)۔ ایک اور جگہ قرآن مجید فرماتا ہے:

''اور اس قرآن کے ساتھ ان سے وہ جہاد کر، جو بڑا جہاد ہے'' (۵۲:۲۵)

ایک اور مقام پر قرآن مجید سورت 25 آیت 52 میں تلقین کرتا ہے کہ کافروں سے بڑا جہاد کر یعنی مسلمانوں کی نازل شدہ مقدس کتاب میں عملی زندگی کے دلائل اور روح کی تلوار سے۔ احادیث میں نبی اکرمؐ کے اقوال اور سنت کی تفصیل درج ہے۔ اس میں یہ بیان بھی درج ہے کہ ایک مرتبہ جب ایک گروہ جہاد میں شرکت کر کے واپس گھر آیا اور وہ بے حد خوش تھا اور وہ لوگ پورے ایمان سے اپنے دین پر عمل کرتے تھے۔ اور کفار سے جنگ جیت کر ایک اہم فریضہ کو ادا کر کے نہایت اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ لیکن رسول اکرم صلعم نے گزرتے ہوئے یہ فرمایا اور جس پر لوگوں کو تعجب بھی ہوا: ''کہ ہم چھوٹے جہاد سے جو مسلمانوں کے خلاف زیادتی کرنے والوں کے خلاف تھا واپس لوٹے ہیں ایک بڑے جہاد کے لئے جو گناہ کے خلاف ہے''۔

مذہبی معاملات میں کوئی جبر نہیں برتنا چاہیے۔ اگرچہ عام تاثر یہی ہے کہ اسلام کی تعلیمات کی صحیح روح یہی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری سورت واضح طور پر یہی بیان کرتی ہے: ''دین میں کوئی جبر نہیں'' (۲۵۶:۲)۔ یہ آیت خاص طور پر اوائل میں اسلام قبول کرنے والوں کے لئے نازل ہوئی تھی۔ جن کے بیٹے جو بت پرستی یا یہودیت میں پیدا ہوئے اور اسی میں جوان ہوئے۔ ان کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کو جبراً اسلام قبول کرایا جائے۔ اسی طرح جب غیر مسلم بچوں کی مائیں اپنے مسلمان رشتہ داروں سے بچوں کو لینا چاہتی تھیں تو رسول اکرمؐ نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ وہ ان کو اپنے پاس زبردستی نہ رکھ لیں۔

''سورۃ حج میں اس کے مقابل یہ نہایت واضح طور پر درج ہے کہ جہاد کا مقصد مساجد، گرجا گھر، یہودیوں کی عبادت گاہوں اور بدھ مت کے راہب خانوں کو تباہی سے محفوظ کرنا ہے'' (۴۰:۲۲)۔

''ہمیں صلیبی جنگوں میں ایسے عیسائی ناموں کی تلاش ہے جنہوں نے

مساجد اور یہودیوں کے عبادتگاہوں کی حفاظت کی ہو۔ البتہ جب مسلمانوں کو سپین سے فرڈینینڈ اور ایسابیلا نے نکالا۔ جہاں انہوں نے صنعت اور علوم کے مختلف شعبوں کو بے مثال ترقی دی تو یہیں سے عیسائیوں کی موجودہ مخالفت کا آغاز ہوا اور قدرتی طور پر جہاد کا موجودہ خیال زور پکڑ گیا کہ جہاد سے مراد اسلام کا عیسائیت کے خلاف حملہ سے حفاظت کرنا ہے۔ درحقیقت مسلمان جرنیلوں کو خاص طور پر یہ ہدایت تھی کہ کسی ایسی جگہ حملہ نہ کیا جائے جہاں مسلمانوں کو عبادت کے لئے اذان دینے کی آزادی ہو یا جہاں ایک مسلمان بلا خوف وخطرہ رہ سکتا ہو اور اپنے دین پر بغیر کسی جسمانی اذیت کے اس کو چلنے کی آزادی ہو۔ تو ایسے علاقہ پر ہرگز حملہ نہ کیا جائے''۔

۹۔ سر ٹی ڈبلیو آرنلڈ

ایک انتہائی علمی اور تاریخ کی معروف تحقیقی کتاب - "Preaching of Islam-A History of the Propagation of the Muslim Faith".

ایک برطانوی معروف مستشرق سر تھامس آرنلڈ نے لکھی ہے جس کا اُردو ترجمہ محکمہ اوقاف، پنجاب، لاہور نے ''دعوتِ اسلام'' کے نام سے شائع کی ہے۔ یہ 460 صفحات پر مشتمل ہے اور مصنف اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے: (صفحات کے حوالے اردو ایڈیشن کے مطابق دیئے گئے ہیں)۔

''اسلام نے اپنے سیاسی زوال اور انحطاط کے زمانہ میں بھی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کیں۔ دو عظیم تاریخی مواقع پر کافروں نے نبی اکرمؐ کے ماننے والوں کی گردنوں پر اپنے پاؤں رکھ کر ان کو پامال کیا۔ لیکن ہر مرتبہ فاتحین نے بالآخر اسی قوم کا مذہب اختیار کر لیا جس کو انہوں نے مغلوب کیا تھا۔ کسی حکومت کی امداد کے بغیر مسلمان مبلغین نے اسلام کی تبلیغ کو وسطی افریقہ، چین اور جزائر ہند چینی تک پہنچایا''۔ (ص۲)

یہ بات کہ اسلام طاقت سے پھیلایا گیا، حقیقت سے بہت دور ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کافر قومیں جنہوں نے مسلمانوں کو شکست دی اور اسلام کے مؤخر زمانہ میں ان پر مدت تک حکومت کی بالآخر وہ بھی مسلمان ہوگئے۔ مصنف قرآن مجید کی اول زمانہ میں مکہ میں نازل ہونے والی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے جن میں مسلمانوں کو دلائل کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ کی ہدایت دی گئی ہے۔ لکھتا ہے:

''اسی قسم کی ہدایات مدنی سورتوں میں بھی ملتی ہے۔ جو اس وقت نازل ہوئیں جب رسول اکرم صلعم ایک بڑی فوج کے کمانڈر تھے اور طاقت کی انتہا پر پہنچ گئے تھے''۔ (ص ص ۳،۴)

اس لحاظ سے قرآن مجید کی اسلام کے بارہ میں تعلیمات میں اولین زمانہ کی آیات سے لے کر بعد میں نازل ہونے والی آیات میں کوئی تفاوت نہیں کہ اسلام کی تبلیغ، امن، دلائل اور پرامن طریق پر کی جائے۔

آرنلڈ صاحب مزید لکھتے ہیں:

''نبی اکرمؐ اسلام کے مبلغین کی ایک لمبی مدت تک تبلیغی کوششوں میں سرفہرست رہے۔ جنہوں نے کفار کے دلوں میں اپنے مذہب کے لئے نہایت عزت واحترام کی جگہ حاصل کی۔ مزید براں ہمیں اسلام کی تبلیغی روح کی شہادت ظالم لوگوں کے ظلم وستم یا انتہا پسندوں کے غیظ وغضب میں تلاش نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ان تصوراتی شخصیات کی مہمات میں جن کو مسلمان جنگ جو کا نام دیا گیا ہے جن کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن مجید تھا۔ لیکن اس حقیقت کو خاموش، گمنام مبلغین کی کوششوں اور مسلمان تاجروں کے نمونہ میں تلاش کرنی چاہیے جنہوں نے دنیا کے ہر کونے میں اسلام کے پیغام کو پہنچایا۔ ایسے پرامن طریق تبلیغ اور دلائل سے لوگوں کو متوجہ کرنے کا طریق اس وقت نہ اختیار کیا گیا، جیسے کہ بعض مغربی مفکرین لوگوں کو باور کرانا چاہتے ہیں بلکہ صرف ان حالات میں کیا گیا جب سیاسی حالات ایسے نہ تھے کہ طاقت اور تشدد کا استعمال ممکن تھا یا سیاسی طور پر ناممکن تھا بلکہ ایسا طریق اختیار کرنے کی ہدایت قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود تھا، جن کا ذکر آگے چل کر آئیگا''۔ (ص ص ۴،۵)

مصنف اس حقیقت کی وضاحت قرآن مجید کی ۱۰ آیات سے کرتا ہے جن کا نزول مکی دور میں ہوا۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

''ایسی مثالیں صرف مکی سورتوں میں ہی موجود نہیں بلکہ ایسی آیات کثرت سے مدنی سورتوں میں بھی موجود ہیں۔ جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا''۔ (ص۶)

یہاں آرنلڈ صاحب بعد کے زمانے کی سات آیات کا حوالہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں: مثال کے طور پر: ''دین میں کوئی جبر نہیں'' (۲:۲۵۶)۔ اور ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تم پھر جاؤ تو ہمارے رسولؐ پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے'' (۶۴:۱۲)

اسی طرح مصنف نے اس غلط خیال کی تردید کر دی ہے کہ وہ آیات جو رسول اکرم صلعم کی زندگی کے آخری حصّہ میں نازل ہوئیں ان میں غیر رواداری اور تشدد کو اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں استعمال کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ رسول اکرمؐ کے مکہ فتح کرنے کے بعد کثرت سے لوگوں کا اسلام میں داخل ہونے کے بارے

میں آرنلڈ صاحب لکھتے ہیں:

''ان لوگوں میں سے جو مکہ کے فتح ہونے کے بعد اسلام یں داخل ہوئے وہ لوگ بھی تھے جو محمد صلعم کی بعثت کے اوائل میں ان پر بدترین ظلم وستم ڈھانے والے تھے اور جن کے ساتھ ان کا صبر وتحمل اور عفو کے سلوک نے ان کو اسلام کی برادری میں شامل کردیا''۔(ص ۳۸)

''عرب کے قبائل نبی اکرمؐ کی تابعداری اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس لئے نہیں کہ آپؐ عرب کی ایک انتہائی بڑی فوجی قوت کے سربراہ تھے بلکہ اس خیال سے بھی کہ آپؐ ایک ایسے سماجی معاشرت کے معلم تھے جس نے دوسرے ہر طرح کے سماجی نظاموں کو کمزور اور غیر موثر بنادیا تھا۔ محمدؐ اس بات میں کامیاب ہوگئے کہ انہوں نے اپنے دور میں ایک باہم لڑنے والے معاشرہ میں قومی اتحاد کے جذبہ کو جنم دیا، ایک دوسرے کے حقوق اور فرائض کا احساس پیدا کیا جو کہ عربوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا یا محسوس کیا تھا''۔(ص ۴۰،۴۱)

آرنلڈ صاحب اپنی کتاب لکھنے کے مقصد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پس ابتدا سے اسلام ایک تبلیغی مذہب کا رنگ لئے ہوئے ہے جو لوگوں کے دلوں کو جیتتا ہے۔ ان کو حلقہ بگوش اسلام کرتا ہے اور ان کو دلائل سے اسلام میں شامل ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور جس طرح یہ طریق شروع میں اختیار کیا گیا تھا یہی طریق آج تک جاری ہے اور اس کے بعد کے صفحات میں اسی مقصد کو بیان کیا جائے گا''۔(ص ۴۴)

رسول اکرم صلعم کی زندگی اور ان کی وفات کے فوراً بعد عیسائی قبائل کے اسلام میں داخل ہونے کے متعلق آرنلڈ صاحب ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''اسلام میں داخل ہونے کیلئے جبر کے عنصر کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عیسائی اور عرب مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات موجود تھے۔ خود رسول اکرم صلعم نے عیسائی قبیلوں سے کئی معاہدے کئے اور ان کو اس بات کا یقین دلایا کہ ان کی حفاظت کی جائیگی اور ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی ضمانت دی اور یہ کہ ان کے پادریوں کو پہلے سے حاصل شدہ حقوق اور اختیار بدستور حاصل رہینگے۔ اسی قسم کے دوستانہ تعلقات اپنے ماننے والوں اور عرب میں رہنے والے لوگوں کے درمیان قائم کئے جو اپنے پرانے مذہبی عقائد پر قائم تھے اور جن میں بہت سے لوگ اپنی رضامندی سے آگے بڑھے اور انہوں نے مسلمانوں کو ان کی فوجی مہموں میں مدد دی اور نئی حکومت کے ساتھ اسی وفاداری کا ثبوت دیا جس طرح انہوں نے رسول خدا صلعم کی موت کے بعد ارتداد سے علیحدگی اختیار کئے رکھی'' (ص ص ۴۷،۴۸)۔

''پہلی صدی ہجری کے مسلمان فاتحین نے عیسائی عربوں کے ساتھ جس رواداری کا سلوک کیا اور پھر ان کی بعد کی نسلوں نے اس روایت کو قائم رکھا۔ مذکورہ بالا مثالوں سے ہم یقینی طور پر اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ عیسائی قبیلے جنہوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے ایسا خود اپنی مرضی اور آزادی رائے سے کیا''۔

آج کل کے عیسائی جو مسلمانوں کے درمیان رہتے ہیں اس رواداری اور مدارات کی زندہ شہادت ہیں۔'' (ص ص ۵۱،۵۲)

آخر میں آرنلڈ صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام مذہبی رواداری اور مذہبی آزادی دیتا ہے جو اپنی حفاظت کے معاوضے میں جزیہ ادا کریں۔ اگرچہ تاریخ اسلام کے صفحات ظلم وستم کے ہنگاموں سے بھی خون آلود ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر کفار کو مسلمانوں کی حکومت میں حد درجہ کی رواداری میسر تھی جو یورپ میں قریب کے زمانہ سے پہلے ہمیں نظر نہیں آتی۔ جبر سے لوگوں کو مسلمان کرنے کی قرآن کی رو سے سخت ممانعت ہے۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت رہی، عیسائیوں کے متعدد فرقوں کا اب تک وجود کا باقی رہنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کو مذہبی آزادی کے حقوق اور سلوک میسر تھے۔ اور اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعصب مسلمانوں کی طرف سے جو ظلم وستم وقتاً فوقتاً عیسائیوں کو اٹھانے پڑے وہ خاص خاص مقامی حالات اور تعصب کی وجہ سے ہوئے تھے ورنہ عدم رواداری کے کسی مقررہ اصول نے ان کی تحریک نہ کی تھی۔ لیکن ایسے جبر واکراہ کا اسلامی شریعت کی مذہبی یا سماجی قانون میں کوئی جواز یا سند نہیں۔ قرآن مجید میں وہ آیات جو جبر کے ساتھ اسلام کو پھیلانے کی ممانعت کرتی ہیں اور تبلیغ کو ہی وہ واحد ذریعہ کی تلقین کرتی ہیں جس کے ذریعہ اس کو پھیلانا چاہیے، ان کے حوالے پہلے دئے جاچکے ہیں۔ اور انہی عقائد کی مسلمان فقہا نے اپنے فیصلوں میں تصدیق کی ہے'' (ص ص ۴۲۰،۴۲۱)

''اسلام کے طاقت ور حکمرانوں کے لئے یہ آسان تھا کہ وہ عیسائی رعایا کو بالکل ختم کردیتے یا اپنی سرزمین سے نکال دیتے جیسے موروں نے سپین کے مسلمانوں کے ساتھ کیا یا انگریزوں نے تقریباً چار صدیوں تک یہودیوں سے کیا۔ مسلمانوں کے مذہبی علماء اور فقہا نے مسلمان حکمرانوں کو اس قسم کے ظالمانہ قصد سے باز رکھا اور ان کا یہ اقدام اسلامی شریعت کی صحیح تصویر تھی جو اسلامی رواداری اور صلح جوئی کے اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اور انہوں نے ایسا اسلامی قانون اور مسلمانوں سے رواداری کے سلوک کے پیش نظر کیا۔'' (ص ص ۴۳۴،۴۴۳)

☆☆☆☆

حضرت بابا گرونانک جی کے سفر۔۳

سید افضل حیدر، سینئر ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ آف پاکستان

ہندو مقدس مقامات کی یاترا

یہاں سے گروجی کوروکشیتر کی طرف روانہ ہوئے جو ہندوؤں کا مقدس مقام تھا اور سورج گرہن کے موقع پر وہاں بہت بڑا میلہ لگا ہوا تھا۔ وہاں پہنچے تو گروجی کے ایک ماننے والے نے آپ کو ہرن کا گوشت پیش کیا۔ گروجی کھانے پینے کے معاملے میں ''پسند و ناپسند'' سے گریز کیا کرتے تھے۔ جو میسر آتا تناول فرما لیتے۔ لہٰذا ان کو عقیدت مند کی دل شکنی منظور نہ تھی۔ لہٰذا اسے ہرن کا گوشت بھوننے کی اجازت دے دی۔ مقامی لوگ گوشت خوری کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ اس تہوار کے موقع پر دھرم کی یہ توہین دیکھ کر طیش میں آ گئے۔ کچھ لوگ ڈنڈے لے کر گروجی کی طرف لپکے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس توہین کرنے والے کو سنگسار کر دیا جائے۔ نانک جی نے جب جوشیلے ہجوم کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پرسکون لہجے میں پوچھا: ''آپ حضرات کی اس دیوانگی کا سبب کیا ہے؟ میں نے آپ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔''

ہجوم اس پرسکون لہجے پر اور بھی مشتعل ہوا اور سب نے بیک زبان کہا: ''اس پوتر جگہ پر ماس بھون کر مہا پاپ کماتے ہو اور یوں معصوم بنتے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟'' نانک جی نے جواب دیا: ''اس بات پر صرف ان لوگوں کو برہم ہونا چاہیے جنہوں نے کبھی گوشت نہ دیکھا ہو۔ لیکن انسان جس کی پیدائش گوشت کے اندر ہوئی ہے اور جو خود سوائے گوشت اور ہڈیوں کے اور کچھ نہیں ہے، جس کو اپنی ماں کی چھاتیوں سے خوراک ملتی ہے، جس کی زبان گوشت کی ہوتی ہے، جس کا منہ گوشت کا ہوتا ہے، جو گوشت پوست کے اپنے جیسے انسان سے ہی شادی کرتا ہے، جو بذات خود بھی گوشت کی تخلیق کرتا ہے اور گوشت ہی میں سانس لیتا ہے، اسے گوشت سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ کیا آپ مجھے کسی ایسے مرد یا عورت کے بارے میں بتا سکتے ہیں، جس کا گوشت سے کوئی تعلق نہ ہو۔''

لیکن ہجوم میں شامل لوگوں نے کہا: ''بے شک انسان کا ہر معاملے میں گوشت سے تعلق رہتا ہے پھر بھی اسے کھانا ایک گناہ ہے۔'' گروجی نے جواب دیا: ''کیا ہم پانی نہیں پیتے؟ وہ پانی جس سے تمام زندگی نمو پاتی ہے۔ پانی انسان، حیوان اور نباتات سب کو حیات عطا کرتا ہے۔ تو کیا ہمیں پانی سے بھی دور رہنا چاہئے کہ وہ زندگی کی افزائش کرتا ہے۔ اور کیا پودوں میں زندگی نہیں ہوتی؟ وہ سانس لیتے ہیں، محبت کرتے ہیں، اپنی زندگی کی افزائش کرتے ہیں اور کیا پودوں میں زندگی نہیں ہوتی؟ اپنی زندگی گزارتے ہیں اور آخر موت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ جو انسان جانوروں کا گوشت کھانا پاپ سمجھتے ہیں کیا اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو قتل کرتے ہیں اور ان کا خون چوستے ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

ہجوم میں سے زیادہ تر لوگ یہ جانتے تھے کہ نانک جی نے کچھ ہی دنوں میں وہاں سے چلے جانا ہے لہٰذا اس سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ جبکہ حساس اور سیدھی مت والے نانک جی کی پرحکمت اور مدلل گفتگو سے متاثر ہو کر ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے۔ پھر نانک جی اپنے نئے پیروکاروں سے یوں مخاطب ہوئے: ''میں صرف اپنے منہ کے چٹخارے کے لیے نہیں کھاتا بلکہ جائز ذرائع سے کمانے والا شخص مجھے خلوص کے ساتھ جو بھی کھانے کو دیتا ہے میں کھا لیتا ہوں۔ اگر میں خدا کی طرف سے عطا کردہ رزق کو ٹھکراؤں تو ایسا کرنا خدا پرستی کے عقیدے کے خلاف ہوگا۔''

مسلمان صوفی شاہ شرف الدین قلندر کے مزار پر

یہاں سے گروجی پانی پت کی طرف روانہ ہوئے، جہاں مشہور زمانہ مسلمان سلمان صوفی شاہ شرف الدین قلندر نے تیرھویں صدی کے آخر میں ایک خانقاہ قائم کی تھی۔ یہاں نانک جی کی ملاقات اپنے ہم نام ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بعد میں آپ کا نائب مقرر ہوا۔ پہلے تو صوفی نے نانک جی سے سوال کیا کہ انہوں نے ایک عام آدمی جیسا لباس کیوں پہنا ہوا ہے اور اپنا سر کیوں نہیں منڈوایا۔ نانک جی نے جواب دیا: ''ہر شخص پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے سر کے بجائے اپنے ذہن کی درستی کرے اور ذہن کی درستی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان ہر ایک کے ساتھ انتہائی انکساری کے ساتھ پیش آئے۔'' نانک جی نے اپنے لباس کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا: ''انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوشیوں کی خواہش اور تکبر کو ترک کرتے ہوئے اپنے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ پھر وہ جو بھی لباس پہنے گا

مقدس ہوگا۔''

جب نانک جی سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ذات اور فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی کس طرح بسر کی ہے، تو آپ نے جواب دیا: ''میرا تعلق سیدھے اور سچے راستے کے فرقے سے ہے۔ جو ذات، آگ اور ہوا کی ہے وہی میری ہے۔ میں درخت اور زمین کی طرح زندگی بسر کرتا ہوں کہ انہی کی طرح کٹ جانے اور اپنے اندر گڑھا کھودنے کے عمل کو تحمل اور ثابت قدمی سے برداشت کرتا ہوں۔ ایک دریا کی طرح مجھے اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ کون میرے اوپر پھول اور کون مٹی پھینکتا ہے۔ صندل کی لکڑی کی طرح تنہا رہنا ہی میرے نزدیک اپنی ذات کو معطر رکھنے کا باعث ہے۔''

پھر ان کے میزبان نے پوچھا کہ ایک درویش کو کیسا ہونا چاہئے؟ تو نانک جی نے جواب دیا: ''وہ شخص جس نے اپنی زندگی میں ہی اپنے آپ کو فنا کر لیا ہو، جو اپنی بیداری میں بھی سوئے ہوئے شخص جیسا بے ضرر ہو اور جو شعوری طور پر اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ صرف وہی شخص ہی درویش ہے جو خوشی اور درد کی دونوں حالتوں میں خوش رہتا ہے۔ جو کسی بات پر برہم نہیں ہوتا اور کبھی تکرار کا شکار نہیں ہوتا۔ جو خدا کے سامنے باادب بیٹھتا ہے۔ اس کے احکام کے علاوہ اور کچھ نہیں سنتا اور تمام موجود اور غیر موجود چیزوں میں اسے خدا کی ذات کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔''

شاہ شرف یہ تمام باتیں سن کر بہت خوش ہوئے انہوں نے احترام سے گرو جی کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور کہا: ''اے خدا کے نیک بندے تجھے سوالات کرنا ضروری نہ تھا۔ تم سے ملاقات ہونا میری خوش بختی ہے۔''

مذکورہ بالا واقعہ سکھ اتہاس اور جنم ساکھیوں سے لیا گیا ہے جو تاریخی اعتبار سے غلط ہیں۔ کیونکہ بوعلی قلندر اور نانک جی میں ڈیڑھ صدی کا فرق ہے۔ لہٰذا ترتیب زمانی کے لحاظ سے دونوں کی ملاقات قرین قیاس نہیں۔ عین ممکن ہے کہ شاہ شرف کوئی اور صوفی بزرگ ہوں جن کو بوعلی قلندر تصور کر لیا گیا ہو۔

(یا گرو نانک جی کو اس خانقاہ میں قیام کے دوران میں صوفی بزرگ سے کشفاً ملاقات ہوئی ہو جسے صوفیاء کی اصطلاح میں کشف القبور کہتے ہیں۔ ناقل)

گرونانک جی دہلی، ہردوار اور درندانہ میں

اس کے بعد گرو نانک جی نے دہلی کی طرف سفر شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شہر کے گردونواح میں بادشاہ وقت کا ایک ہاتھی مر گیا تھا اور مہاوت اس خوف سے پریشان تھا کہ ان کی ملازمت ختم کر دی جائے گی۔ جب انہوں نے گرو نانک جی کی آمد کے بارے میں سنا تو ان کے پاس جا کر کہا کہ ہاتھی کو زندہ کرنے کی تدبیر کریں۔ لیکن گرو نے جواب دیا، زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اور کوئی انسان بھی اس کے پراسرار کاموں میں دخل نہیں دے سکتا۔ بہترین بات یہ ہے کہ اس کی عطا کردہ چیزوں سے ہی مسرت حاصل کی جائے۔ انسان اپنی زندگی میں بہترین اشیاء کے حصول کی دعا کرتا ہے لیکن زندگی خدا کی عطا کردہ بہترین اشیاء میں شمار ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کائنات کا مالک اپنی عطا کردہ ''زندگی'' واپس لینا چاہے تو انسان کو انتہائی خوشی کے ساتھ اس کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

یہاں سے گرو نانک جی ہردوار گئے جہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگ دریائے گنگا کے کنارے کھڑے ہو کر مشرق کی طرف پانی پھینک رہے ہیں۔ گرو جی نے وجہ دریافت کی تو لوگوں نے جواب دیا: ''ہم پرلوک سدھارے ہوئے یعنی دوسرے جہان پہنچے ہوئے اپنے مرحوم بزرگوں کو اس مقدس دریا کا پانی بھیج رہے ہیں تاکہ ان کی آتمائیں آنند یعنی روحانی خوشی سے رہیں۔'' یہ سنتے ہی گرو جی نے مغرب کی طرف پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ وہاں موجود لوگ نانک جی کے اس غیر معمولی فعل سے بہت پریشان ہوئے اور مغرب کی طرف پانی پھینکنے کی وجہ پوچھی۔ گرو جی نے جواب دیا: ''میں ہندوستان کے شمال مغربی حصّے سے تعلق رکھتا ہوں وہاں میری جائے پیدائش کے قریب ایک باغ ہے۔ میں اسے یہاں سے پانی دینا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بعد وہاں خشک سالی نہ آ گئی ہو'' وہاں موجود پجاری اس معصومانہ جواب پر ہنسنے لگے اور کہا کہ تم اتنے بالغ اور باشعور تو ضرور ہو کہ یہ سامنے کی بات کو سمجھ سکو کہ تمہارا پھینکا ہوا پانی تمہارے باغ تک نہیں پہنچ سکتا۔'' نانک جی نے جواب دیا: ''تم بہت عجیب بات کر رہے ہو میرا پھینکا ہوا پانی تو چند سو میل دور نہیں جا سکتا جبکہ تمہارا پھینکا ہوا پانی دوسری دنیا تک پہنچ جاتا ہے'' تمام لوگ یہ بات سن کر سناٹے میں آ گئے اور اپنے عقیدے پر نانک جی کے جرأت مندانہ اعتراض اور اس میں پنہاں ناقابل تردید منطق پر ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ نانک جی نے انہیں تبلیغ کرتے ہوئے کہا: ''جو خدا کو یاد رکھتا ہے اور صحیح راستے پر چلتا ہے اس کی روح نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی پر سکون رہتی ہے۔ ایسے شخص کے معاملے میں رب کو راضی کرنے کے لیے کسی رسم ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ایک جگہ پر جب گرو نانک جی ایک برہمن کے باورچی خانے میں داخل ہوئے تو اس نے غصّے سے آگ بگولا ہوتے ہوئے پوچھا کہ نانک جی نے اپنی آمد سے اس رسوئی کو ناپاک کیوں کیا ہے؟ اس پر گرو نانک جی نے جواب دیا: ''تمہارا باورچی خانہ تو پہلے ہی تم جیسے غصیلے شخص کی موجودگی کے باعث پلید ہے کیونکہ تم نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے اپنے ہی جیسے انسانوں سے اس قدر نفرت کرتے ہو کہ صرف ان کی موجودگی سے ہی تمہارا گھر ناپاک ہو جاتا ہے۔'' اس سچ بیانی نے برہمن

کو اور بھی برہم کر دیا۔ تب گرو جی نے کہا: ''ڈھول بجانے والی عورت کا نام جہالت ہے، قصاب کی بیوی کا نام ظلم وتشدد، بہتان طرازی کرنے والا دل بھنگی اور وہ غصّہ جو دماغ کو تباہ کر دیتا ہے، اس کی مثال ایک چمار کی سی ہے۔ اے برہمن اس بات کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ تم ان چاروں نچلی ذاتوں سے نفرت کر کے اپنے دل کو تو ناپاک کر لو لیکن اپنے باورچی خانے میں ان کے آنے کو منحوس خیال کرو۔''

پھر نانک جی نے برہمن سے کہا: ''سچائی اپنے نفس پر ضبط کرنے، اچھے اعمال اور خدا کے نام کی تسبیح کرنے کو اپنی طہارت خیال کرنے میں ہے تا کہ معبود کے پاس اسے شرف قبولیت مل جائے۔ خدا کا نام لینے سے طہارت ہوتی ہے۔''

سفر کے دوران بابا نانک جی ہندوؤں کے ایک اور انتہائی مقدس مقام درندادانہ پہنچے۔ وہاں آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ مہاراج کرشن کی زندگی پر ایک ڈرامہ 'کرشنا لیلا' پیش کر رہے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے بہت مایوس ہو گئے کیونکہ وہ کسی مذہبی جذبے یا نیکی کی خاطر ڈرامہ نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کا مقصد لوگوں کو خوش کر کے پیسے کمانا تھا۔ وہاں گرونانک جی نے کہا: ''چیلے ساز بجا رہے ہیں اور گورو رقص کر رہے ہیں۔ ان کے پاؤں اور سروں کی حرکات بہت تیز ہیں۔ اور دیکھو وہ دیوانوں کی طرح اپنے بالوں پر مٹی پھینک رہے ہیں۔ یہ سب کچھ مجمع کو خوش کرنے کے لیے ہے۔ وہ اپنی طمع کی تسکین کے لیے وقت ضائع کر رہے ہیں۔ وہ گوپی، کرشنا، سیتا اور رام کی داستانوں کے بعض حصوں کو پیش کر رہے ہیں۔ لیکن خدا کا حقیقی خدمت گار وہی ہے جس پر اس کا کرم ہے۔

خدا کا سچا بندہ خدا کا ایسا بندہ شبنمی صبح کو ذہن میں ایک جذبے کو لے کر بیدار ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑے دانا کی دانائی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ باقی لوگوں کا رقص کیا ایسے ہی ہیں جیسے بیجوں کا تیل نکالنے کے لیے ان پر اچھل کود کی جائے یا جیسے دھاگا بننے والے پہیے، یا پھر ہاتھ کی چکیاں اور کمہار کے چاک ہوتے ہیں۔ اور جیسے صحراؤں اور پہاڑوں میں نہ تھمنے والے بگولے ہوتے ہیں۔ اور جیسے دودھ بلونے اور اناج اگانے کے آلات ہوتے ہیں۔ اور جیسے پرندے ہوں جن کی پرواز میں آرام کا کوئی مقام نہ ہو۔ اچھل کود اور رقص کرنے والے لوگ ان گنت ہیں۔ جو اپنی عادتوں میں مجبور ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے اس طرح رقص کرتے ہیں۔ آخر کار ماتم ہی کرتے ہیں۔ جو لوگ دور دراز تک اڑان نہیں کرتے اور نہ ہی معجزانہ شخصیت بنتے ہیں تو ایسا رقص کرنے والے لوگ خدا کو خوش کرنے کی بجائے محض تفریح کرتے ہیں۔ اے نانک خدا صرف اسی شخص سے محبت کرتا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔'' (ص:465)

دوسرے سفر سے واپسی

اپنی دوسری ''اداسی'' یا سفر سے واپسی پر بابا نانک جی نے ملتان کا دورہ کیا۔ ملتان تاریخ کے مدوجذر کا شکار ہونے کے علاوہ ہمیشہ صوفیاء کا مرکز رہا ہے۔ اس وقت بھی یہاں بیک وقت کئی صوفی، ولی اور درویش موجود تھے۔ بابا نانک جی کی آمد کی اطلاع پاتے ہی ملتان کے صوفیا ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے اور ان کے راستے میں دودھ بہا کر استقبال کیا۔ جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ شہر پہلے ہی مذہبی مبلغین کا گڑھ ہے۔ بابا نانک جی نے دودھ کے ایک پیالے میں موتیے کے پھول کی چند پتیاں ڈال دیں جو اس بات کی علامت تھا کہ انہیں ابھی تک ایسی کٹیا کی تلاش ہے، جہاں خلوص میسر ہو۔ بھائی گرو داس کا بیان ہے کہ انہوں نے پھول کی پتیوں کو دودھ میں ایسے ملا دیا جیسے گنگا اور سمندر کا پانی۔

طویل سفر کے بعد گرونانک جی پنجاب واپس پہنچے اور دریائے راوی کے کنارے کرتار پور کے مقام پر ڈیرہ ڈالا۔ یہاں انہوں نے اپنی زندگی کے اٹھارہ برس بسر کیے۔ ''جنم ساکھی'' کے مطابق یہ وہ عرصہ تھا جب ان کے چیلوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ یہاں لوگ لنگر کے لیے آتے اور ہر ذات کے لوگ اکٹھے قطاروں میں بیٹھتے۔ وہ اپنے آپ کو عوام اور سماج کی ''سیوا'' کے لیے مختص کر دیتے۔ گرو جی کے درس سنتے اور مل کر بھجن گاتے۔ بابا نانک جی ان کے لیے روحانی مصروفیات سے وقت نکالتے، کھیت میں کام کرتے اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے۔

کرتار پور میں واپسی اور اپنے جانشین کا انتخاب

اس دور کا سب سے اہم واقعہ کرتار پور میں واپسی اور اپنے جانشین کا انتخاب میں لھنا کی آمد بیان ہوتا ہے جو چیلے کی حیثیت سے آیا اور گرو کا جانشین منتخب ہوا۔ لھنے کو جانشین مقرر کرنے کے بعد بابا نانک جی ان کے سامنے کھڑے ہوئے، پانچ تانبے کے سکے ان کی نذر کیے، ان کی قدم بوسی کی اور انہیں گرو انگد کے نام سے پکار کر ہر آنے والے گرو کی تقدیم وتکریم کی روایت قائم کی۔ اور یہ تعلیم بھی دی کہ گرو ہمیشہ زندہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے جھکنا ہی بڑائی ہے۔

گرونانک جی کے آخری لمحات

روایات میں بابا نانک جی کی زندگی کے آخری لمحات کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ: ''ہم انہیں دفن کریں گے۔'' ہندو کہتے تھے کہ ''نہیں ہم جلائیں گے۔'' بابا نانک جی نے سب کو اکٹھا کیا ہندو دائیں طرف اور مسلمان بائیں طرف تھے اور انہیں کہا کہ اب پھول پھینکو۔ پھول پھینکے گئے۔ پھر سب سے کہا کہ خدا کی حمد وثناء کرو۔ اس کے بعد انہوں نے چادر اوڑھ لی۔ جب چادر اٹھائی گئی تو وہاں

پھولوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے پھول بالکل تازہ تھے۔

جنم ساکھیوں کے مطابق گرونانک جی اعلیٰ مبلغ، شریف النفس، بردبار، محبت اور عنائتوں سے مالامال تھے جنہوں نے اپنے دور کے شعور کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ وہ ناانصافی اور ظلم کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بابا نانک جی نے جانشین کے لیے منفرد معیار مقرر کیا۔ مثلاً گرونانک جی کے پہلے جانشین گرو انگد ان کے چیلوں میں سے تھے۔ اس انتخاب میں گرو نے اپنے بیٹے کو نظرانداز کر دیا اور جس چیلے کو گرو چنا گیا اسے پہلے گرو کے مساوی مرتبہ دیا گیا۔ بابا نانک جی نے انہیں اپنی تمام ذمہ داریاں سونپ دیں۔ روشنی اور شعر کہنے کی صلاحیت بھی نئے گرو کو عطا کر دی جو نانک جی کا خاصہ اور طرۂ امتیاز تھی۔ بابا نانک جی نے لھنا کو چیلا بنایا لیکن جب وہ گرو بنا تو اس کی گرو کی حیثیت سے تعظیم کی۔ یہ سلسلہ اسی طرح آٹھ نسلوں تک چلا۔ دس گروؤں کو آج بھی ایک جیسی عزت اور تعظیم دی جاتی ہے۔

سکھ مذہب میں گرو کا مقام

سکھوں کا ایمان ہے کہ تمام گرو بابا نانک جی کی طرح سچے مخلص مبلغ تھے۔ اور سب گرو، بابا نانک جی تھے۔ ستا بلونت جو گرو انگد کے بھجن گایا کرتے تھے ان کے قصیدے بھی گروگرنتھ میں محفوظ ہیں۔ ایک قصیدہ ہے ''بابا نانک نے لھنا کو گرو بنایا، وہ (گرو انگد) بھی وہی روشنی ہے، بس بابا نانک نے جسم بدلا ہے۔'' تیسرے اور چوتھے گرو امرداس اور رام داس کے متعلق بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار ہے کہ ''بابا نانک امرداس کے روپ میں اترے۔'' لوگ امرداس کے سر پر گرو (نانک) کا سائبان دیکھ کر حیران رہ گئے اور گرو امرداس نے وہی تھڑا حاصل کیا۔'' گرو رام داس کے متعلق لکھا ہے کہ ''خدا وہ ہے جس نے تجھے احسن طریقے سے تخلیق کیا، تو نانک ہے، تو لھنا ہے، تو امرداس ہے۔'' بھائی گروداس نے پانچویں گرو کا ایک قصیدہ لکھا کہ ''نانک نے لھنا کو جانشین بنایا اور اپنی روشنی کے ساتھ گرو انگد کے اندر آ گیا۔ انگد کے سر پر بھی وہی چھتری تھی اور بابا نانک کی طرح تھڑے پر بیٹھا۔ پھر امرداس، پھر رام داس، پھر ارجن اور ہرگوبند، سب کا مرتبہ یکساں ہے۔ ارجن نے خود کو ہرگوبند میں منتقل کیا اور اس پر سب کچھ عیاں کر دیا۔''

روایت کے مطابق بابا نانک جی کی شخصیت ہر آنے والے گرو میں منتقل ہوتی رہی اور یہ سکھوں کے ایمان کا حصّہ ہے۔ موبد ذوالفقار اردستانی نے ایک صدی بعد اپنی فارسی تصنیف ''دبستان مذاہب'' میں لکھا: ''سکھ کہتے ہیں جب نانک نے اپنا جسم چھوڑا تو گرو انگد میں جذب ہو گئے۔ جو ان کا سب سے زیادہ مخلص چیلا تھا۔ گرو انگد خود بابا نانک تھا اس کی وفات کے بعد گرو انگد، امرداس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ اسی طرح وہ رام داس میں منتقل ہو گیا اور رام داس نے اسی طریقے سے ارجن سے الحاق کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو یہ تسلیم نہیں کرتے کہ گرو ارجن بابا نانک نہیں ہیں وہ کافر ہیں۔''

آخر گرو گوبند نے اپنی منظوم سوانح عمری میں خود کو نانک جی کہا ہے۔ ''نانک نے انگد کا جسم اپنایا۔ اس کے بعد امرداس کہلائے۔ ایک چراغ کی روشنی دوسرے میں منتقل ہوتی رہی۔ امرداس، رام داس بنا اس نے مسند ارجن کو دے دی، ارجن نے ہرگوبند کو نامزد کیا۔ ہرگوبند نے ہررائے کو اپنا آپ بنایا۔ اس کے بعد ہرکرشن گرو بنا، اور ہرکرشن کے بعد تیغ بہادر آیا۔''

''کایا پلٹ'' کا یہ عقیدہ سکھوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ اس طرح گرونانک جی ان کے ایمان کے مطابق زندہ ہیں۔ گروؤں میں کوئی فرق روا نہ رکھنے کی ایک اور مثال ''گروگرنتھ'' ہے جس میں تمام شبد ھ اور بھجن نانک جی کے نام سے ہیں اور اس ترتیب سے کہ نانک اول، نانک دوم، نانک سوم وغیرہ۔

گرو کی ''کایا پلٹ'' کا یہ عقیدہ سکھ ازم کے فروغ میں معاون ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ معاصر سماجی فضاء اور ہنگامی حالات نے بھی بڑھوتری کا کام کیا۔ سکھ ازم کا فروغ ان حالات میں ہوا کہ نئے نئے چیلنج ابھر رہے تھے۔ سیاسی سماجی اور مذہبی حوالوں سے ایک نئی فضا بن رہی تھی۔ اس نئی صورتحال میں نئے جوابات کی ضرورت تھی۔ اس وقت تک ''کایا پلٹ'' کا تصور پوری طرح پنپ چکا تھا اور اپنی عملی شکل میں موجود تھا۔ ہر گرو نے بابا نانک جی کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے اپنے دور کے تاریخی عوامل کے پیش نظر اپنے مذہبی عقائد کو ارتقائی مراحل سے گزارا اور اپنے پیروکاروں کی سماجی تنظیم بھی کی۔

پانچویں گرو ارجن نے سکھوں کو مقدس کتاب ''گروگرنتھ'' عطا کی اور ان کے لیے مذہبی مرکز گولڈن ٹمپل دربار صاحب امرتسر میں تعمیر کرایا۔ ''گروگرنتھ'' میں انہوں نے گروؤں کی تعلیمات اور منظومات کے علاوہ دور وسطی کے ہندو اور مسلمان صوفیوں کے کلام اور افکار کو بھی جگہ دی۔ لیکن جگہ صرف ان افکار کو دی گئی جو بابا نانک جی کی تعلیمات سے ہم آہنگ تھے۔ ان صوفیا اور دانشوروں میں حضرت بابا فریدؒ، کبیر، نام دیو اور راما نند نمایاں ہیں۔ گرو ارجن نے دربار صاحب کا سنگ بنیاد معروف مسلمان صوفی بزرگ حضرت میاں میرؒ صاحب سے رکھوایا تھا۔ حکمرانوں کی طرف سے سختیوں کا جواب گرو ارجن نے نہایت صبر کے ساتھ مصائب جھیل کر دیا۔ ان کے پیش رو گرو نے ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی لگائی۔ لیکن جب امن کے ذریعے مذہب کو بچانے میں ناکام ہوئے تو انہوں نے خود کو نبرد آزما کے طور پر پیش کیا اور دو

لاہور احمدیہ انجمن، فجی کی کنونشن اپریل 2010ء منعقدہ (سووا) فجی کی جھلکیاں

محترم ڈاکٹر محمد علی صاحب، صدر، احمدیہ انجمن (آسٹریلیا) حضرت امیر ایدہ اللہ سے بیان القرآن کے لائبریری ایڈیشن کا سیٹ وصول کر رہے ہیں

حضرت امیر مولوی فضل حق صاحب، مبلغ فجی، کی منگنی کا تحفہ پیش کرنے کے بعد

محترم محبوب رضا صاحب (سیکرٹری) فجی احمدیہ انجمن تقریر فرما رہے ہیں

عزیزی صالحہ تلاوت قرآن مجید اور تقریر کر رہی ہیں

برادرم عامر عزیز الازہری (جنرل سیکرٹری) مرکزی انجمن کنونشن کے ایک اجلاس سے خطاب فرما رہے ہیں

نسوری ہائی سکول، فجی کی بلڈنگ کا ایک حصّہ

محترم عمران ساہو خان صاحب ترنم سے منظوم کلام پیش کرتے ہوئے

مولوی فضل حق صاحب، مبلغ فجی، تقریر کرتے ہوئے

حضرت امیر ایدہ اللہ نوجوان رضوان الدین سے بیعت لے رہے ہیں

کنونشن کے موقع پر فجی کی خواتین حضرت امیر ایدہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہی ہیں

محترمہ ثمینہ ملک صاحبہ، انچارج تراجم وطباعت کتب، امریکہ تقریر فرما رہی ہیں

محترم عبدالنسیم صاحب، صدر، فجی احمدیہ انجمن (لاہور) مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے

نسوری، فجی میں تحریک احمدیہ لاہور، فجی کے ہائی سکول کی عمارت

وونومینو، فجی میں احمدیہ انجمن (لاہور) جماعت کا سب سے دیرینہ اسلامی
پرائمری سکول

جامع ہدایت الاسلام، نسوری، فجی

فجی احمدیہ انجمن (لاہور) نسوری کے ہائی سکول کی وسیع عمارت کا ایک منظر

تلواریں اٹھائیں اوران کے متعلق کہا کہ ایک ان کی روحانی طاقت اوردوسری جسمانی طاقت کا مظہر ہے۔نویں گرو تیغ بہادر کوشاہی احکامات کے مطابق پھانسی دی گئی۔

سکھ ازم میں اہم موڑ

تاریخ یہاں سے فیصلہ کن موڑ لیتی ہے۔اسی دباؤ کے دور میں سکھ مذہب کے رہنما اصول مرتب ہوئے۔سکھوں کا عقیدہ ہے کہ گرو گوبند سنگھ کی جدوجہد بابا نانک کے مشن کی تکمیل تھی۔انہوں نے ایک سخت اخلاقی اورنسلی نظم پیدا کیا اور گرو گوبند سنگھ کے نزدیک بھی ہندو مسلم ہم آہنگی اتنی ہی اہمیت رکھتی تھی جتنی کہ بابا نانک جی کے ہاں تھی۔جب انہوں نے شاہی افواج کے خلاف مزاحمت کا آغاز کیا تو پیر بدھا شاہ جو مسلمان رہنما تھا اوراس کا خاصا مذہبی اثر ورسوخ تھا،اپنے بیٹوں اور مریدوں کے ہمراہ ان کی طرف سے لڑا۔اس لڑائی میں بدھوشاہ کے بھائی اور بیٹے شہید ہوئے۔گرو گوبند سنگھ کا بھجن ہے کہ ''ہندو اور مسلمان ایک ہیں ان کا خالق اور رب ایک ہے۔مسجد اور مندر،نماز اور پوجا میں کوئی فرق نہیں،اور تمام انسان ایک ہیں۔''

سکھوں کا نقطہ نظر ہے کہ ان کی مزاحمت گرو نانک کے اپنے تصورات سے الگ نہیں ہے۔ان تعلیمات میں مخصوص دھیمے پن سے ناانصافی،جارحیت اورظلم کی ہمیشہ مذمت ہوئی ہے۔ اس کے ثبوت ان کے وہ شبدھ پیش کئے جاتے ہیں جو''بابربانی'' کے نام سے مشہور ہیں۔جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ گرو نانک جی بابری افواج کی لشکرکشی کے خلاف تھے۔حالات کا گھیرا ہندوؤں اور مسلمانوں کے گرد بھی تنگ ہو رہا تھا۔گرو گوبند سنگھ کے دور میں جو کچھ ہوا وہ فطرت کا ردعمل تھا۔

گرو گوبند سنگھ نے گروؤں کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔جس وقت انہوں نے اپنی موت کا اعلان کرنے کے لیے سکھوں کو اکٹھا کیا تو کہا اس وقت جو سکھ ہیں، ان کے مرنے کے بعد وہ گرو ہوں گے۔گرو کی روح کے متعلق انہوں نے کہا کہ اب وہ گرنتھ اور خالصہ میں ہے، یہ بھی گرو ہوگا۔اس اعلان کے بعد گرو گوبند سنگھ نے گرو گرنتھ کا پاٹھ کیا اور نذرانہ دیا۔اس وقت سے گرو گرنتھ ہی کو''گریائی'' کا مظہر اور زندہ گرو تسلیم کیا جاتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

''اورہم نے تیرے ذکر کو تیرے لئے بلند کیا'' (۹۴:۴)

''ایک ایسی شخصی زندگی، جو ہرطائفہ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو،صرف محمد رسول اللہؐ کی سیرت ہے۔اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو،اگر غریب ہو تو شعب ابو طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو،اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو،اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو،اگر فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ،اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ اُحد سے عبرت حاصل کرو،اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہّ کی درس گاہ کے معلم قدس کو دیکھو،اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ،اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو،اگر تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یارومددگار نبیؐ کا اسوہ حسنہ تمہارے سامنے ہے،اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمن کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو،اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم ونسق درست کرنا چاہتے ہو تو خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو،اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو،اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو،اگر تم جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو،اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصریٰ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو،اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبے کے ایک گوشے میں کھڑا کررہا ہے،مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظرِ انصاف میں شاہ وگدا اور امیر وغریب سب برابر تھے،اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو،اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ اور حسنؓ اور حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو۔غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، رسول اللہؐ کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ تمہاری سیرت کی درستی واصلاح کے لیے سامان،تمہارے ظلمت خانہ کے لئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور،محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔اسی لیے طبقہ انسانی کے ہر طالب اور نورِ ایمانی کے ہر متلاشی کے لئے صرف حضورؐ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔جس کی نگاہ کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے،اس کے سامنے نوحؑ وابراہیمؑ ،ایوبؑ ویونسؑ ،موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں۔

غرض ایسی کامل وجامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم پر گروہ اور ہر صنفِ انسانی کے لئے ہدایت کی مثالیں اور نظریں رکھتی ہو، وہی اس لائق ہے جو اس اصناف وانواع سے بھری دنیا کی عالمگیر اور دائمی رہنمائی کا کام انجام دے۔

(ماخوذ از خطبات مدراس از سید سلمان ندوی،اردو اکیڈمی۔کراچی ۱۹۸۴، ص ص ۱۰۸۔۱۱۳)

رخصتی کے وقت حضرت ام المومنین سیّدہ عائشہؓ صدیقہ کی عمر۔۲

غلام نبی مسلم ایم۔اے

۲۔علامہ ابن کثیر

مشہور مورخ و محقق علامہ عماد الدین ابن کثیر اپنی تصنیف ''البدایہ والنہایہ'' میں سیدہ اسماءؓ بنت ابوبکرؓ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اسماء ۷۳ھ میں ایک سو سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔ وہ اپنی بہن عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں۔ وھی اکبر من اختھا عائشة بعشر سنین (جلد۸ص۳۴۶)

اب اگر ۷۳ھ میں حضرت اسماء کی عمر ایک سو سال تھی تو ہجرت کے آغاز میں وہ ۲۷، ۲۸ سالہ تھیں۔ اس صورت میں ان سے دس سال چھوٹی عائشہؓ ہجرت کے وقت ۱۷۔۱۸ سال کی ہوئیں۔ اس سے ۱۳ سالہ مکی دور نبوت نکالئے تو بعثت نبویؐ کے وقت ان کی عمر چار پانچ سال کی ہوئی جب کہ آنحضرت کی عمر ۳۵۔۳۶ سال کی تھی اور اسی طرح سیدہ عائشہؓ ۲ھ میں رخصتی کے وقت اٹھارہ انیس سال کی تھیں۔

۳۔صاحب مشکٰوۃ کی روایت

حدیث کی مشہور کتاب ''مشکٰوۃ المصابیح'' کے مولف شیخ ولی الدین اپنی تالیف ''اکمال فی اسماء الرجال'' میں لکھتے ہیں کہ رخصت کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر اٹھارہ انیس سال سے کم نہ تھی اور اس ضمن میں وہ علامہ ابن کثیر سے ہم آہنگ ہیں۔

۴۔سید سلیمان کی اپنی رائے

مقامِ مسرت ہے کہ ان کی زیر نظر اپنی تصنیف ''سیرۃ عائشہؓ'' ہی میں انہوں نے غیر شعوری طور پر ہماری رائے کی تائید کی ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

۱۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کا آخری حصّہ حضرت عائشہؓ کی زندگی کا آخری زمانہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سڑسٹھ برس کی تھی (ص ۱۵۳)۔

۲۔ حضرت عائشہؓ بیوہ تھیں اور اس عالم میں انہوں نے زندگی کے چالیس مرحلے طے کئے (ص ۱۱۱)۔

سید سلیمان ندوی کٹر روایت پرست ہیں مگر حقائق نے ان کی زبان پر حق جاری کر دیا ہے۔ اگر وہ ان دونوں روایتوں پر مجموعی نظر ڈالتے تو ہماری ہم نوائی کرتے انہوں نے وفات کی وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سڑسٹھ سال لکھی تھی۔ غالباً ان کے سامنے ابن کثیر اور صاحب مشکٰوۃ کی روایت تھیں۔ اب ۶۷ سال میں سے بیوگی کے چالیس سال نکال دیجئے۔ تو آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت ام المومنین حضرت عائشہؓ کی عمر ۲۷ سال بنتی ہے۔ آنحضرت صلعم کا دور نبوت ۲۳ سال تھا۔ ۲۷ سال میں سے ۲۳ نکالئے تو بعثت کے وقت سیدہؓ کی عمر چار سال ہوئی۔ اس طرح بھی آپ اس سال پیدا ہوئیں۔ جب آنحضرت صلعم کی عمر ۳۶ سال تھی۔ نیز حضرت فاطمہؓ سے قبل شادی ہو جانے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آپ حضرت فاطمہؓ سے عمر میں بڑی تھیں اور سیدہ فاطمہؓ سے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ ان کی ولادت اس سال ہوئی جب خانہ کعبہ کی تعمیر نو ہوئی اور آنحضرت صلعم کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۵ سال تھی۔

غور کیجئے ان شواہد کی روشنی میں سید سلیمان ندوی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے دعاوی کس حد تک قابل اعتماد ہیں اور اگر عالم اسلام تسلیم کر لے کہ رخصتی کے وقت سید عائشہؓ کی عمر نو سال کی بجائے ۱۷ یا ۱۹ سال تھی تو اس میں اسلام، آنحضرتؐ اور سیدہ عائشہ کی سیرت پر کیا اعتراض وارد ہوتا ہے؟

روایت کی شہادتیں

تاریخ کی شہادت تو قارئین کے سامنے ہے۔ آیئے اب سیدہ عائشہؓ کے اقوال، علمی مرتبہ اور واقعاتِ حیات پر غور کریں۔ تاہم غور و فکر سے پہلے سید سلیمان ندوی مرحوم کی ذیل کی تحریر پڑھ جایئے:

''عموماً ہر زمانہ کے بچوں کا وہی حال ہوتا ہے جو آج کل کے بچوں کا ہے کہ سات آٹھ برس تک تو انہیں کسی بات کا مطلق ہوش نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی بات کی تہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن حضرت عائشہؓ لڑکپن کی ایک ایک بات یاد رکھتی تھیں۔ ان کی روایت کرتی تھیں۔ ان سے احکام مستنبط کرتی تھیں۔ لڑکپن کے جزئی واقعات کی مصلحتوں کو بتاتی تھیں۔ لڑکپن کے کھیل کود میں اگر کوئی آیت ان کے کانوں میں پڑ جاتی تھی تو اس کو بھی یاد رکھتی تھیں کہ مکہ میں یہ آیت بل الساعة موعد هم و الساعة ادهی و امر (۵۴: ۴۶) نازل ہوئی تو میں کھیل رہی تھی۔ ہجرت کے

وقت ان کا سن آٹھ برس کا تھا۔لیکن کم عمری اور کمسنی میں ہوش مندی اور قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ ہجرت نبویؐ کے تمام واقعات بلکہ تمام جزئی باتیں ان کو یاد تھیں۔ان سے بڑھ کر کسی صحابی نے ہجرت کے واقعہ کا تمام مسلسل بیان محفوظ نہیں رکھا ہے ۔(۵۴: ۴۶) (سیرۃ عائشہؓ ص۲۳)

بلاشبہ سیدہ عائشہؓ طاہرہ بلا کی ذہین، نکتہ رس اور دقیق النظر تھیں مگر طبعی عمر کے تقاضوں کے مطابق آپ بھی سات آٹھ برس تک دوسرے بچوں کی طرح تھیں۔ دراصل سید سلیمان صاحب نے حضرت عائشہؓ کی کم سنی کو اصول اور مرکزی نقطہ قرار دے کر نتائج اخذ کئے ہیں حالانکہ سیدہؓ کی زندگی کے واقعات ہی سے عیاں ہے کہ وہ کم عمر نہ تھیں بلکہ آپ ہر دور کے بچوں کی طرح تھیں۔جیسا کہ ہر دور میں ہم عمر بچوں میں ذہانت کا فرق ہوتا ہے۔آپ بھی ہم عمروں میں ممتاز تھیں۔مگر یہ درست نہیں کہ جو بات ایک بچہ نو یا دس سال کی عمر میں سمجھ سکتا ہے آپؓ چار پانچ سال کی عمر میں سمجھ جاتی تھیں۔

سورۃ القمر اور سیدہ عائشہؓ کی عمر

سید سلیمان ندویؒ کی تحریر کے مطابق صحیح بخاری کتاب التفسیر میں سیدہ عائشہؓ سے روایت ہے۔ **لقد انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ وانی لجاریۃ بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر** میں لڑکی تھی کہ مکہ میں آنحضرت صلعم پر سورۃ القمر کی آیت **بل الساعۃ** الخ نازل ہوئی۔

اول تو اس روایت میں حضرت عائشہؓ نے اپنے آپ کو نزول آیت کے متعلق جاریہ (لڑکی) بتایا ہے اور لڑکی کہلانے کے لئے چھوٹی بچی ہونا ضروری نہیں۔پھر تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ سورۃ القمر بعثت نبویؐ سے چار پانچ سال بعد نازل ہوئی۔حضرت عائشہؓ ان دنوں لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ آیات آنحضرت صلعم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔اور جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''سات آٹھ سال کی عمر تک بچوں کو کسی بات کا مطلق ہوش نہیں ہوتا۔اس لئے بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر نو، دس سال تھی اور آپؓ کی پیدائش بعثت نبوی سے چار پانچ سال پہلے ہوئی تھی''۔اگر سید صاحب کی یہ بات مان لی جائے کہ سیدہ صدیقہؓ کی ولادت کی تاریخ نبوت کے پانچ سال کا آخری حصہ ہوگا (ص۲۱) یا یہ باور کر لیا جائے کہ حضرت عائشہؓ پیدا ہوئیں تھیں تو نبوت کے چار سال گزر چکے تھے اور پانچواں سال گزر رہا تھا (ص۲۱) تو اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قبول کرنا ہوگی کہ نبوت کے پانچویں سال سورۃ القمر کے نزول کے وقت عائشہ صدیقہؓ زیادہ سے زیادہ چند ماہ کی تھیں اس لئے یا تو بخاری کی سورۃ القمر والی روایت درست نہیں یا جناب صدیقہ طاہرہ کی تاریخ پیدائش بعثت سے چار پانچ سال پہلے تھی۔

آخر سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ہم مسلک بخاری کی ان دو روایتوں میں کس طرح تطبیق دیں گے۔

۱۔ جب ۵ بعثت میں سورۃ القمر نازل ہوئی تو عائشہ صدیقہؓ محلّہ کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی تھیں اور آیت **والساعۃ ادھیٰ وامر** پڑھتی تھیں۔

(بخاری کتاب التفسیر، سورۃ القمر)

حضرت خدیجہؓ نے نبوت کے دسویں سال ہجرت مدینہ سے تین سال قبل ماہِ رمضان میں انتقال کیا اور اس سے ایک ماہ بعد ماہِ شوال میں آنحضرتؐ نے عائشہ صدیقہؓ سے نکاح کیا۔(بخاری بروایت عروہؓ)

تو نکاح کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی اور جناب ابوالاعلیٰ مودودی کی تحقیق کی رو سے تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں بلکہ نزول سورہ کے ایک سال بعد پیدا ہوئیں تھیں۔

ان ہر دو روایتوں کی رو سے صحیح بخاری جہاں سیدہ عائشہؓ کی آنحضرتؐ سے شادی چھ سال کی عمر میں ۱۰ بعثت میں بتاتی ہے اور ہمیں یقین دلاتی ہے کہ جناب سیدہ عائشہؓ کی ولادت بعثت کے پانچویں سال ہوئی وہاں یہ بھی ذکر کرتی ہے کہ اپنی ولادت کے اسی سال عائشہ صدیقہؓ مکہ کی لڑکیوں کے ساتھ کھیلتی اور سورۃ القمر کی آیات پڑھتی تھیں۔

واقعات کے مضمرات کی شہادت

اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ مکہ کی زندگی میں معراج اور ہجرت نبویؐ کے جو تفصیلی حالات سیدہ عائشہؓ نے بیان کئے ہیں وہ کسی دوسرے صحابی کی روایت میں نہیں ملتے اور اس تفصیل کی توقع کسی ایسی لڑکی سے رکھنا عبث ہے جس کی اپنی عمر ہجرت کے وقت آٹھ سال بیان کی جاتی ہے۔اس امر سے بھی واضح ہے کہ ہجرت کے وقت آپ سترہ اٹھارہ سال کی ایسی بالغ النظر جوان لڑکی تھیں۔جس کا شعور، قوت مشاہدہ، حافظہ اور ادراک حالات کافی پختہ ہو چکا تھا۔

سیدنا ابوبکرؓ کی تیمارداری

مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ شدید بیمار ہو گئے تو سیدہ عائشہؓ کی والدہ محترمہ اور بڑی بہن حضرت اسماءؓ کے ہوتے ہوئے بھی والد کی تیمارداری آپؓ کے سپرد ہوئی۔ سیدہ عائشہؓ ہی روایت کرتی ہیں کہ جب آپ والد محترم سے خیریت دریافت کرتیں تو وہ یہ شعر پڑھتے

کل امرءٍ مصبح فی اھلہ　　والموت ادنیٰ من شراک نعلہٖ

اگر ہجرت کے پہلے سال حضرت عائشہؓ کی عمر آٹھ سال تھی اور اگلے سال رخصتی کے وقت آپ ۹ سال کی تھیں تو پھر بڑوں کے ہوتے ہوئے آپ کو تیمارداری کی خدمت کیوں سونپی گئی اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ ایک کم عمر بچی کو شعر کیوں سناتے تھے۔ سچ یہی ہے کہ سیدہ عائشہؓ اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھیں اور سخن فہمی کا کامل ملکہ رکھتی تھیں۔

''اصابہ'' کی روایت اوپر درج کر چکے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی پیدائش خانہ کعبہ کی تعمیر نو کے وقت ہوئی جب کہ آنحضرتؐ کی زیادہ سے زیادہ عمر ۳۵ سال تھی اور سیدنا عائشہؓ سیدہ فاطمہؓ سے چار پانچ سال چھوٹی تھیں۔ لیکن تاریخ ہی ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح آنحضرتؐ سے ۱۰ بعثت میں ہوا اور اس سے قبل سیدہ عائشہؓ کی منگنی جبیر بن معطم کے لڑکے سے ہو چکی تھی۔ جب کہ سیدہ فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح سیدہ عائشہؓ کے نکاح سے پانچ سال بعد ۲ ھ میں مدینہ میں ہوا اور حضرت فاطمہؓ کے نئے گھر کو خود سیدہ عائشہؓ نے آراستہ کیا اور سید سلیمان ندوی ہی کے الفاظ میں مکان لیپا۔ بستر لگایا۔ اپنے ہاتھ سے کھجور کی چھال دھن کر تکیے بنائے۔ چھوہارے اور منقے دعوت میں پیش کئے۔ لکڑی کی الگنی تیار کی کہ اس پر پانی کی مشک اور کپڑے لٹکائے جائیں۔ (سیرۃ عائشہؓ)

کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ سیدہ عائشہؓ عمر میں سیدہ فاطمہؓ سے قدرے بڑی تھیں یا کم از کم ہم عمر تھیں اور ہر دو کی پیدائش کعبہ کی تعمیر نو کے قریبی زمانہ میں ہوئی۔

جنگ اُحد میں غازیان دین کی سقائی

جنگ اُحد کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر دس سال بتائی جاتی ہے۔ لیکن تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اس لڑائی میں دیگر خواتین اسلام کے ساتھ آپؓ نے بھی کندھے پر پانی کی مشک اٹھائی ہوئی تھی۔ مدینہ سے پانی بھرتیں اور تین میل دور اُحد کے پہاڑ کے دامن میں دن بھر مجاہدین کو پانی پلاتی رہیں۔ کیا یہ کارنامہ کوئی دس سالہ لڑکی انجام دے سکتی تھی؟ چھ سال کی عمر میں آپ کے نکاح کے مویدین کا سارا استدلال اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ وہ نو سال کی عمر میں وظیفہ زوجیت ادا کر سکتی تھیں اور ان فرائض و وظائف کو نظر انداز کر دیا ہے، جو رسول اللہ صلعم کے اہل بیت ہونے کے ناطے سے آپؓ پر عاید ہوتے تھے۔ کیا اُحد میں شرکت ایک گڑیاں کھیلنے والی کمسن لڑکی کی ہمت کا مظاہرہ ہے؟ کیا اسی واقعہ سے عیاں نہیں کہ آپ اس قدر بڑی ہو چکی تھیں کہ آپؓ بلا خوف وخطر میدان جنگ میں سقائی کے فرائض انجام دیتی رہیں اور اس وقت آپؓ کی عمر بلا شبہ بیس اکیس سال تھی۔

علم الانساب اور سخن فہمی

اس بات پر سب متفق ہیں کہ سیدہ عائشہؓ طاہرہ علم انساب شعر وادب، تنقد وفہم سخن، تفسیر قرآن، فقہ، حدیث اور طب میں یکتائے روزگار تھیں۔ اور آج تک نسوانی دنیا میں منفرد مقام رکھتی ہیں جیسا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی اعتراف ہے کہ:

''حضورؐ اللہ کے رسول تھے جن کے سپرد انسانی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا اور معاشرے کو اس انقلاب کے لئے تیار کرنا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ ایک غیر معمولی قسم کی لڑکی تھیں جنہیں اپنی ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس معاشرے کی تعمیر میں حضورؐ کے ساتھ مل کر اتنا بڑا کام کرنا تھا۔ جتنا دوسری تمام ازواج مطہرات سمیت اس وقت کی کسی عورت نے نہیں کیا۔ بلکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے کسی راہنما کی بیوی بھی اپنے شوہر کے کام کی تکمیل میں ایسی زبردست مددگار نہیں بنی جیسی حضرت عائشہؓ حضور اکرمؐ کی مددگار ثابت ہوئیں۔''

(ترجمان القرآن ص ۲۱ ستمبر ۷۶ء)

بلا شبہ آپؓ نے تفسیر قرآن، فقہ، حدیث، دینی علوم کی تعلیم سرور عالمؐ کے فیض صحبت سے حاصل کی اور طب کا علم بھی کاشانہ نبوت میں سیکھا۔ مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ سیدہ عائشہؓ نے علم انساب اور ذوق شعر وادب سرور کائنات سے پایا کیونکہ آنحضرتؐ نساب تھے نہ شاعر۔ نہ ہی آپؐ کو فریضہ رسالت سے فرصت تھی کہ سیدہؓ کو یہ علم پڑھاتے۔ نہ ہی تاریخ بتاتی ہے کہ سیدہؓ نے یہ فن مدینہ منورہ میں کسی دوسرے شخص سے حاصل کیا۔ دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ آپؓ کے والد محترم سیدنا ابوبکر صدیقؓ علم انساب کے ماہر اور شعر وادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے''۔ بقول سید سلیمان ندویؒ: ''حضرت ابوبکرؓ سارے قریش میں علم الاسباب اور شعر کے ماہر تھے۔ قریش کے شاعروں کے جواب میں اسلام کے زبان دان شاعر چوٹی کے جو شعر

کہتے تھے کفار کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کی اصلاح و مشورے کے بغیر لکھے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس باپ کی آغوش میں تربیت پائی تھی اس لئے علم انساب کی واقفیت اور شاعری کا ذوق ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ (سیرۃ عائشہؓ ص ۳۴)

پس انساب، شعروادب اور سخن فہمی میں کمال حضرت عائشہؓ نے مکہ ہی میں اپنے والدمکرم حضرت ابوبکرؓ سے حاصل کیا۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؓ سات آٹھ سال کی عمر میں ہجرت کر گئی تھیں تو پھر یہ ناممکن ہے کہ آپؓ نے مکہ میں چھ سات سال کی عمر میں ہی یہ علوم کما حقہ حاصل کر لئے تھے کیونکہ شعرفہمی اور تاریخ دانی کے لئے ذہنی نشو ونما اور شعور کی پختگی درکار ہوتی ہے اور اس کے لئے بالغ العمر اور بلیغ النظر ہونا ضروری ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ نہ تو آپؓ کا چھ برس کی عمر میں نکاح ہوا اور نہ رخصتی ۹ سال کی عمر میں قابل فہم ہے۔ مکی زندگی میں ان علوم کا حصول ظاہر کرتا ہے کہ آپؓ ان علوم میں کمال حاصل کر کے اٹھارہ سال کی عمر میں کاشانہ نبویؐ میں داخل ہوئیں۔

افک کا واقعہ

افک کا واقعہ ۵ ھ سے متعلق بیان کیا جاتا ہے جب عام روایت کی رو سے آپؓ کی عمر ۱۲ سال بنتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ افک کے المیہ میں سیدہ عائشہؓ کا کردار ایک ۱۲ سالہ لڑکی کا سا تھا یا ایک عالمۂ قرآن، بالغ النظر، متحمل مزاج، پاک سیرت، سنجیدہ، جواں سال خاتون کا تھا۔ ایک غیرت مند، باحیا، باشعور اور خوددار خاتون کی طرح آپؓ اس بہتان کو محسوس کرتی ہیں اور جب آپؓ کی بریت اور پاک دامنی کے بارے میں آسمانی شہادت نازل ہوئی اور والدہ محترمہ نے آپؓ کو آنحضرتؐ کا شکریہ ادا کرنے کو کہا تو آپؓ نے بے ساختہ زبان مبارک سے جچا تلا جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا شکریہ کیوں نہ کروں جس نے میری پاک دامنی کی شہادت دی۔ ایسے پریشان کن حالات میں مقام توحید کا یہ ادراک اور حق گوئی وصاف بیانی کا یہ اسلوب کسی بارہ سالہ لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔

واقعہ تخییر

عام روایت کی رو سے جب تخییر کی آیت نازل ہوئی تو آپ ۱۶ سال کی ہو چکی تھیں۔ ازواج مطہرات نے بدلے ہوئے بہتر مالی حالات میں آنحضرتؐ سے زندگی کی آسائش کا مطالبہ کیا۔ آنحضرتؐ کو یہ تقاضہ پسند نہ آیا اور آنحضرتؐ کی طرف وحی نازل ہوئی۔

''اے نبیؐ تو نے (ازواج سے علیحدگی اختیار کر کے) ایک حلال بات کو اپنے لئے حرام کیوں کر لیا۔ تو تو اپنی ازواج کی خوشنودی کا جویا رہتا ہے اور اللہ تو خطاپوش رحیم ہے۔'' (تحریم)

اس آیت کے نزول سے آنحضرتؐ کی رحمت جوش میں آئی۔ رنج و ملال کافور ہو گیا۔ ایلاء کی مدت ختم ہو گئی تو آپؐ سیدھے حجرہ عائشہؓ میں تشریف لے آئے۔ سیدہؓ نے ازراہِ تفنن کہا کہ آپؐ تو ایک دن پہلے ہی آ گئے ہیں۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا کہ مہینہ کبھی ۲۹ دن کا بھی تو ہوتا ہے۔ ایلاء کے معاً بعد آنحضرتؐ پر آیت تخییر نازل ہوئی کہ ''اے نبیؐ! ازواج سے کہیے کہ اگر وہ دنیا کی زینت اور اموال کی خواہشمند ہیں تو آئیں، سامان لیں اور رخصت ہو جائیں۔ اور اگر انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اخروی نعمتوں کی آرزو ہے تو پھر وہ دنیوی آسائشوں سے دستبردار ہو جائیں۔'' حضرت عائشہؓ کی عظمت اسلام سے والہیت، ذہنی پختگی، شعور کی بیداری اور بصیرت کا اندازہ تو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ ایمان آزما سوال سب سے پہلے جواں سال حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی سے کیا۔ اور فرمایا کہ جواب دینے میں جلدی بازی نہ کرو بلکہ والدین سے مشورہ کرنے کے بعد بتاؤ کہ تمہیں دنیا کی آسائشیں درکار ہیں یا اس کے مقابل اللہ اور رسولؐ اور نعمائے آخرت کو چاہتی ہو۔ یہ سنتے ہی سیدہ عائشہؓ کا چہرہ فرطِ جوش ایمان سے چمک اٹھا۔ اور بلا تامل عرض کی یارسول اللہؐ! اس میں والدین سے مشورہ کی کیا ضرورت ہے مجھے تو تمام کی تمام نعمتوں کے مقابل اللہ اور اس کا رسولؐ ہی پسندیدہ و مطلوب ہیں۔ قارئین فیصلہ کریں کہ کیا یہ ایمان افروز جواب کسی ۱۵۔۱۶ سالہ لڑکی کی زبان سے ہے یا کسی ایسی دیانتدار، باشعور، بالغ النظر اور پختہ عمر خاتون کا فیصلہ ہے جو معرفت، حکمت، زہد، تقویٰ اور عشق خدا اور رسولؐ کی منزلیں طے کر کے انتہائی بلندیوں پر پہنچ چکی تھیں۔

عشق رسولؐ کا ایک ایمان افروز واقعہ

قاضی محمد سلیمان مرحوم اپنی تصنیف ''رحمتہ اللعالمین'' جلد دوم میں لکھتے ہیں:

''سیدہ عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلعم اپنے نعل کو پیوند لگا رہے تھے۔ میں چرخہ کات رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کی پیشانی مبارک پر پسینہ آ رہا ہے۔ اس پسینہ کے اندر ایک نور بھر رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ یہ ایسا نظارہ تھا کہ میں سراپا حیرت بن گئی۔ آپؐ کی مبارک نظر مجھے پر پڑی۔ فرمایا۔ عائشہؓ تم حیران کیوں ہو رہی ہو؟ میں نے کہا یارسول اللہؐ! میں نے دیکھا کہ حضورؐ کی پیشانی پر پسینہ ہے اور پسینے

کے اندر چمکتا دمکتا نور ہے۔ اس پاک نظارہ نے مجھے سراپا چشم بنا دیا ہے۔

اے خنک چشمے کہ او حیران اوست دے ہمایوں دل کی آں قربان اوست

بخدا اگر ابوبکرؓ ہذلی حضورؐ کو دیکھ پاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کے اشعار کے صحیح مصداق حضورؐ ہی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے اشعار کیا ہیں میں نے یہ اشعار سنائے:

دمبری من کل غیر حیفة وفساد مرضعة وداءِ معضل

(وہ ولادت اور رضاعت کی آلودگیوں سے مبرا ہیں)

واذا نظرت الیٰ اسرة وجهة برقت کبرق العارض معضلِ

(ان کے درخشاں چہرے پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ نورانی اور درخشاں برق جلوہ دے رہی ہے)

نبی اکرمؐ کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اسے رکھ دیا۔ پھر سیدہ عائشہؓ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا۔ **ماسرورت منی کسروری** ۔"جو سرور مجھے تمہارے کلام سے ہوا ہے اس قدر سرور تمہیں میرے نظارے سے نہیں ہوا ہو گا۔" رخ نور پر نگاہ شوق و محبت، ابوبکر ہذلی کے اشعار کا انتخاب اور آنحضرتؐ کے چہرہ درخشاں سے تشبیہہ اہل نظر کے لئے دعوت فکر ہے۔ اس واقعہ کے ضمن میں سیدہ عائشہؓ کی قوت مشاہدہ، نکتہ رسی، فصاحت و بلاغت، وسیع علم اور عمیق نظر پر غور کیجئے۔ کیا یہ عظمت ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی کا حصّہ ہے جو نو سال کی عمر میں اہل بیت نبی بنیں۔ یا ایسی خاتون کی ذہانت و فصاحت کا عکس ہے جو ٹھوس و سیع علمی صلاحیتوں کے ساتھ کاشانہ رسالتؐ میں آئیں اور آنحضرتؐ کے فیضان صحبت و نظر سے کما حقہٗ مستفیض ہوئیں۔

آسمانی مقصد کی تکمیل

حضرت عائشہؓ مطہرہ نے آنحضرتؐ کے وصال کے بعد تفسیر، فقہ اور حدیث کی ترویج میں بیمثال خدمات انجام دیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب آپؓ حجرہ نبویؐ میں آئیں تو اس وقت آپؓ فصاحت و بلاغت، ادب و شعر اور علم الانساب میں دسترس رکھتی تھیں۔ جس کی موجودگی میں آپؓ نے آنحضرتؐ کی صحبت میں علوم و حکمت قرآن سے بہرہ کامل حاصل کیا۔ پھر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے آپؓ کو علوم دینیہ کی تحصیل میں انتہائی سہولت میسر آئی۔ علاوہ ازیں مدینہ کی مستورات نسوانی مسائل آپ ہی کی وساطت سے حضور اکرمؐ سے دریافت کرتی تھیں۔ پھر مسجد نبویؐ سے قرب کی وجہ سے آپ کو آنحضرتؐ کے مواعظ حسنہ، شعراء کے قصائد اور تقاریر سننے کا بہ کثرت موقعہ ملتا تھا اور ازواج النبی کا آسمانی مشن یہ تھا **واذ کرن مایتلی فی بیوتکن من آیات الله والحکمة** اور علمائے تاریخ بخوبی جانتے ہیں کہ تبلیغ قرآن و حکمت کا جو فریضہ حضرت عائشہؓ نے ادا کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اور اگر آپؓ کی بدولت یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا تو ازواج مطہرات ارشاد الٰہی کی کما حقہٗ تعمیل سے محروم ہو جاتیں۔ اس ضمن میں جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے دیکھئے:

"علم حدیث کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ذریعہ جتنا علم دین مسلمانوں کو پہنچا اور فقہ اسلامی کی معلومات حاصل ہوئیں اس کے مقابلے میں عہد نبوت کی عورتیں تو درکنار مرد بھی کم ہی ایسے ہیں جن کی علمی خدمات کو پیش کیا جا سکے۔ اگر حضرت عائشہؓ حضورؐ کے نکاح میں نہ آتیں اور آپؐ سے تعلیم و تربیت پانے کا ان کو موقع نہ ملتا تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے علم کا کتنا بڑا حصّہ امت مسلمہ تک پہنچنے سے رہ جاتا۔ ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں اور وہ صرف حدیث روایت کرنے والی نہ تھیں بلکہ فقیہ اور مفسر اور مجتہد اور مفتی بھی تھیں۔ انہیں بالاتفاق مسلمان عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہ مانا جاتا ہے۔ اکابر صحابہؓ ان سے مسائل پوچھتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی بعض مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا شمار مدینہ طیبہ کے ان چند علماء میں ہوتا تھا جن کے فتوے پر لوگوں کو اعتماد تھا۔" (ترجمان القرآن ستمبر ۷۶ء)

سیدہ عائشہؓ کو ازواج مطہرات اور خواتین اسلام میں یہ منفرد مقام تبھی میسر آیا کہ آپؓ ذہنی صلاحیتوں سے مزین و آراستہ ہو کر پختہ عمر میں آنحضرتؐ کے ہاں آئیں اور اپنا دامن علم و حکمت قرآن سے بھرا اور اس حد تک بھرا کہ کوئی دوسرا صحابی آپ کا ہمسر و سہیم نہ تھا۔ اور یہ مقام کسی ایسی لڑکی کی قسمت کا حصّہ نہیں جو بقول بعض نو سال کی عمر میں گڑیوں کے ساتھ نبی اکرمؐ کے گھر آئی۔ عظمت و رفعت کا یہ ارفع و اعلیٰ مقام خیر النساء عالم، ام المومنین سیدہ عائشہؓ کو تبھی حاصل ہوا جب آپؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی توجہ و کاوش سے ذہنی نشو و نما پا کر اٹھارہ انیس سال کی عمر میں آنحضرتؐ سے رشتہ ازواج میں منسلک ہو گئیں۔ **فھل من مدکر** ۔ (کیا پھر کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے) (۱۷:۵۴)۔

☆☆☆☆

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے تعلقات کا کامل نمونہ

تقریر متن محترمہ جسارت نذر رب ایم۔ اے

برموقع جلسہ عید میلاد النبی صلعم زیر اہتمام تنظیم خواتین احمدیہ، لاہور

انسان کے تعلقات کی مختلف صورتیں

انسان کے تعلقات تین طرح کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا تعلق تو ہمارا خدا سے ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمارا خالق و رازق ہے۔ خالق کے بعد ہمارا تعلق مخلوق سے ہے کیونکہ مخلوق میں کوئی ہمارا معلم ہے۔ کوئی ہمارا مہربان ہے۔ کوئی ہمارا دردخواہ ہے۔ کوئی ہمارے آرام و آسائش میں کوشاں ہے۔ کوئی ہماری محبت اور توجہ کا محتاج ہے۔ کوئی اپنی کمزوریوں کی وجہ سے مدد کا طلب گار ہے۔ غرض ہزاروں طریقوں سے ہزاروں لوگ ہم سے متعلق ہیں۔ اگر ہمارے معاملات ان سے درست نہ ہوں۔ اگر ہم ان سے بدخلقی سے پیش آئیں تو معاشرے کا امن و امان جاتا رہتا ہے۔ اور فساد و بغاوت میں ترقی ہوتی ہے۔ پس اگر ہمارے اخلاق مخلوق سے درست نہ ہوں تو ہم ایک ڈاکو کی طرح ہیں جو دنیا سے اس کے امن و امان کا سامان لوٹتا ہے اور غارت کرتا ہے۔

تیسرا تعلق ہمارا خود اپنے نفس سے ہے۔ کیونکہ یہ بھی ہماری بہت سی توجہات کا محتاج ہے۔ اور جس طرح ہمارا خالق سے منہ موڑنا یا مخلوق سے بداخلاقی سے پیش آنا نہایت مضر ہے، اسی طرح ہمارا اپنے نفس سے بدسلوکی کرنا اور اخلاقِ رذیلہ سے پیش آنا نہایت برے اثرات مرتب کرتا ہے اور فساد کا باعث ہے۔ اس لئے وہی انسان کامل ہوسکتا ہے جو ان تینوں معاملات میں کامل ہو۔ اور تمام صفات میں سے ایک صفت میں بھی کمزوری نہ دکھائے۔

اخلاق کا کامل نمونہ

اگر ہم ان تینوں اقسام اخلاق کو مدنظر رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اکثر انسان جو اخلاق میں کامل سمجھے جاتے ہیں وہ بھی بہت سی کمزوریاں رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ایک قسم کے اخلاق میں کامل سمجھے جاتے ہیں تو دوسری قسم میں انہیں کوئی دسترس حاصل نہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے پیاروں اور پاک بندوں کا گروہ ہی ایسا نکلے گا جو ان تینوں اقسام اخلاق میں کمال رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم رسول پاکؐ کے اخلاق کا غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام صاحب کمال لوگوں کے سردار تھے اور باوجود اس کے کہ دنیا میں بہت سے صاحب کمال لوگ گذرے ہیں۔ لیکن جس رنگ میں آپؐ رنگین تھے اس کے سامنے سب رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ اور جن خوبیوں کے آپؐ جامع تھے ان کا عشر عشیر بھی کسی اور انسان میں نہیں پایا جاتا۔ اس سلسلہ میں حضرت مسیح موعودؑ اپنی فارسی نظم میں فرماتے ہیں:

عجب نوریست در جان محمدؐ	یعنی محمدؐ کی جان میں عجب نور ہے
عجب لعلیست در کان محمدؐ	محمدؐ کی کان میں عجب ہیرہ ہے
ندانم، ہیچ نفسے در دو عالم	دونوں جہانوں میں میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا
کہ دارد وشوکت وشانِ محمدؐ	جس کی محمدؐ جیسی شان وشوکت ہو

ہم اس بات سے قطعی منکر نہیں کہ آپؐ سے پہلے بھی اور آپؐ کے بعد بھی بڑے صاحبِ کمال لوگ پیدا ہوئے لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں اور آنحضرت صلعم کی مثال دیئے اور سورج کی سی ہے، سمندر اور دریا کی ہے۔ کیونکہ وہ تمام خوبیوں کے جامع تھے۔ جو مختلف اوقات میں مختلف صاحبِ کمال لوگوں نے حاصل کیں۔ آپؐ اللہ کی محبت اور اس کے احکام کی اطاعت میں ایسا غرق ہو گئے اور کاملیت کے اس انتہائی نقطہ پر پہنچے کہ وہ تخلقوا باخلاق اللہ کہنے والا انسان خود اس قول کا کامل نمونہ تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ سے تعلق کی انتہا

جہاں تک رسول کریم کا اللہ سے تعلق کا کمال ہے تو ہم جانتے ہیں کہ آپؐ اپنے دعویٰ نبوت سے پہلے بھی اللہ کی تلاش میں میلوں دور غار حرا کی تنہائیوں میں عبادت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی راتوں کو آرام سے گذارنے کی بجائے اپنے رب کی عبادت میں گذارتے۔ انسان جس وقت لوگوں سے جدا ہوکر دعا مانگتا

ہے تو اس وقت اسے کسی بناوٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے رب سے تخلیہ میں اپنے سچے خیالات اور دکھ کا اظہار کرتا ہے۔

آنحضرتؐ اخلاق فاضلہ میں بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ آپؐ سے زندگی کے ہر شعبہ میں بہترین اخلاق کا اظہار ہوا۔ محبت الٰہیہ کے نتیجہ میں آپؐ کے دل میں خدا تعالیٰ اور اس کے دین کے لئے بے حد غیرت پائی جاتی تھی۔ آپؐ نے نہ صرف دشمنوں کے مقابلہ میں غیرت دینی کا مظاہرہ کیا بلکہ اپنے صحابہ میں سے بھی اگر کسی سے احکام الٰہیہ کی ہتک ہوتی تو اس پر آپؐ اظہار غیرت سے باز نہ رہتے۔

آپؐ کے اخلاق کریمانہ آپؐ کی تمام زندگی پر محیط ہیں۔ آپؐ خُلق میں کمال کے درجہ پر تھے۔ آپؐ کا ایمان، آپؐ کا اخلاق، آپؐ کا انصاف، آپؐ کی سخاوت، تحمل و بردباری، صداقت، صبر و شکر، محنت، سادگی و دیانت و امانت، اتحاد و اتفاق، قناعت، شجاعت، شرم و حیا، عاجزی و انکساری، عفو و درگذر، میانہ روی، آداب ملاقات، وقار عمل، رواداری اور محبت غرضیکہ آپؐ نے ہر موقع پر اپنی زندگی میں ایسی صفات میں لازوال مثالیں چھوڑیں۔ اگر ان واقعات کا ذکر کیا جائے تو لامحدود وقت درکار ہوگا۔ اس لئے اس سلسلہ میں حضرت مسیح موعودؑ کا ''براہین احمدیہ'' سے ایک اقتباس پڑھ کر مضمون کو ختم کروں گی۔ آپ فرماتے ہیں:

''خدا تعالیٰ کا ارادہ انبیاء اور اولیاء کی نسبت یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہر ایک قسم کے اخلاق ظاہر ہوں اور بہ پایہ ثبوت کو پہنچ جائیں۔ سو خدا تعالیٰ اس ارادے کو پورا کرنے کی غرض سے ان کی نورانی عمر کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک حصّہ تنگیوں اور مصیبتوں میں گذرتا ہے اور ہر طرح سے دکھ دیئے جاتے ہیں تا کہ وہ اعلیٰ اخلاق ان کے ظاہر ہو جائیں کہ جو بغیر سخت تر مصیبتوں کے ہرگز ظاہر اور ثابت نہیں ہو سکتے۔ اگر ان پر وہ سخت تر مصیبتیں نازل نہ ہوں تو یہ کیونکر ثابت ہو کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو مصیبتوں کے پڑنے سے اپنے مولا سے بے وفائی نہیں کرتے بلکہ اور بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ سو خدا تعالیٰ ان پر مصیبتیں نازل کرتا ہے تا کہ ان کا صبر، ان کا صدق قدم، ان کی استقامت، ان کی وفاداری، لوگوں پر ظاہر کر کے **الاستقامت فوق الکرامت** (استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے) کا مصداق ان کو ٹھہراوے کیونکہ کامل صبر بجز کامل مصیبتوں کے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ درجہ کی استقامت اور ثابت قدمی بجز اعلیٰ درجے کے زلزلے کے معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ مصائب حقیقت میں انبیاء اور اولیاء کے لئے روحانی نعمتیں ہیں جن سے دنیا میں ان کے اخلاق فاضلہ میں وہ بے مثل ہیں اور آخرت میں ان کے درجات کی ترقی ہوتی ہے۔

اور دوسرا حصّہ انبیاء اور اولیاء کی عمر کا فتح میں، دولت میں بمرتبہ کمال ہوتا ہے۔ تا کہ اس کے وہ اخلاق ظاہر ہو جائیں کہ جن کے ظہور کے لئے فتح مند ہونا، صاحب دولت ہونا، صاحب اختیار ہونا، صاحب اقتدار ہونا، صاحب طاقت ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اپنے دکھ دینے والوں کے گناہ بخشنا اور اپنے ستانے والوں سے درگذر کرنا اور اپنے دشمنوں سے پیار کرنا اور اپنے بداندیشوں سے خیر خواہی کرنا یہ سب اخلاق ایسے ہیں جن کے ثبوت کے لئے صاحب دولت اور صاحب طاقت ہونا شرط ہے اور یہ اسی وقت بہ پایہ ثبوت پہنچتے ہیں کہ جب انسان کے لئے دولت اور اقتدار میسر ہوں کیونکہ بجز زمانہ مصیبت وادبار، زمانہ دولت و اقتدار یہ دونوں قسم کے اخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اس لئے حکمت کاملہ ایزدی نے تقاضا کیا کہ انبیاء اور اولیاء کو ان دونوں طور کی حالتوں سے کہ جو ہزار ہا نعمتوں پر مشتمل ہیں متمتع کرے۔''

آنحضرت صلعم پر کمال وضاحت سے یہ دونوں حالتیں وارد ہوئیں اور ایسی ترتیب سے آئیں کہ جس سے تمام اخلاق فاضلہ آنحضرتؐ میں مثل آفتاب کے روشن ہو گئے اور مضمون **انک لعلی خلق عظیم** (۶۸: ۴) (اور تو یقیناً بلند اخلاق رکھتا ہے) کی صفت بہ پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ آنحضرت صلعم کے اخلاق کا دونوں طور پر علی وجہ الکمال ثابت ہونا تمام انبیاء کے اخلاق کو ثابت کرتا ہے کیونکہ آپؐ نے ان کی نبوت اور ان کی کتابوں کی تصدیق کی۔ اور ان کا مقرب ہونا ظاہر کر دیا۔

مصطفیٰ پر تیرا بےحد ہو سلام اور رحمت
اس سے یہ نور لیا بار خدایا ہم نے
اس سے بہتر نہ نظر آیا کوئی عالم میں
لاجرم غیروں سے دل اپنا چھڑایا ہم نے
ہم ہوئے خیر امم تجھ سے ہی اے خیر الرسل
تیرے بڑھنے سے قدم آگے بڑھایا ہم نے
آدمی زاد تو کیا چیز فرشتے بھی تمام
مدح میں تیری وہ گاتے ہیں جو گایا ہم نے

☆☆☆☆

بھائیوں جیسی دوستی کی یادیں

حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم ومغفور کے دو بھانجے
ڈاکٹر وحید احمد صاحب مرحوم اور رشید احمد صاحب مرحوم

از ناصر احمد

ڈاکٹر غلام محمد صاحب مرحوم ومغفور کا شمار ہماری جماعت کے اولین بزرگوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو لاہور کے کئی ہنگامہ خیز اجتماعات میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل رہا۔ آپ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور اور ووکنگ مسلم مشن اینڈ لٹریری ٹرسٹ، لاہور کے ممتاز اور تاحیات ممبر اور معتمد رہے۔ کچھ سالوں کے لئے مرکزی احمدیہ انجمن، لاہور کے صدر بھی رہے۔ صوبہ سرحد میں میڈیکل سروس چھوڑ کر لاہور میں برانڈرتھ روڈ پر ذاتی کلینک میں پریکٹس کرتے تھے اور لاہور کے قابل ترین، بااخلاق اور ہمدرد ڈاکٹر کے طور پر ان کا ایک خاص مقام تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم ومغفور کی بہن تھیں جو نیکی، شگفتگی اور ملنساری کی مثال تھیں۔

ان کے بیٹے ڈاکٹر وحید احمد صاحب کی شادی انگلستان کے ایک ممتاز کاروباری شخصیت محترم خواجہ محمد غوث صاحب کی بیٹی ورجینیا غوث سے ہوئی۔ خواجہ محمد غوث صاحب کا آبائی گھر سیالکوٹ تھا۔ پھر خواجہ صاحب کاروباری سلسلہ میں سنگاپور گئے اور اس کے بعد انڈونیشیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد واپس سیالکوٹ آ گئے۔ اس کے بعد پھر سرجیکل آلات کے کاروبار کے سلسلہ میں بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں کاروبار میں ان کو کافی کامیابی ہوئی لیکن تقسیم ہند کے بعد ان کو کاروبار کا زیادہ بہتر مواقع انگلستان لے گیا۔ چنانچہ یہ پوری فیملی 1952ء میں بمبئی سے لندن چلی گئی اور لندن کے مشہور کاروباری مرکز ریجینٹ سٹریٹ میں خواجہ صاحب نے کپڑوں اور زیورات کا کاروبار ''مہارانی'' کے نام سے شروع کیا جس کو اللہ تعالیٰ نے کافی شہرت اور عروج بخشا۔ ایک ممتاز کاروباری شخصیت ہونے کے ناطے سے ووکنگ مسجد میں عیدین اور دیگر مذہبی اور سماجی اجتماعات میں یہ فیملی بالالتزام شریک ہوتی اور اس طرح اس فیملی کا ووکنگ مسجد کے حلقوں میں تعارف ہوا اور اس کے نتیجہ میں خواجہ محمد غوث صاحب کی بڑی بیٹی ورجینیا غوث کا حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم ومغفور بانی ووکنگ مسلم مشن، انگلستان کے بھانجے ڈاکٹر وحید احمد صاحب سے عقد ہوا۔ اور ورجینیا بھابی نے لندن کے ریجینٹ سٹریٹ کے معروفِ زمانہ کاروباری اور بارونق جگہ کو چھوڑ کر ایک نیک سیرت اور انسانی ہمدردی کے پیکر ڈاکٹر وحید احمد صاحب کی رفیقہ حیات بن کر لاہور کے خوبصورت، جدید اور سرسبز وشاداب آبادی ''گلبرگ'' میں آبسیرا کیا۔ بھابی جان نے خوب ساتھ نبھایا اور ڈاکٹر صاحب کی فیملی اور دیگر ذمہ داریوں میں ان کا برابر کا ساتھ دیا۔ آپ ایک مدت تک تنظیم خواتین احمدیہ، لاہور کی سرگرم رکن اور خازن رہیں۔ جب تک ان کی صحت نے اجازت دی وہ تمام ذمہ داریاں نہایت احسن طریق پر ادا کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ بھابی جان کو صحت کاملہ میں رکھے اور اپنے فضل وکرم سے نوازتا رہے۔

ڈاکٹر وحید احمد صاحب نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد والد صاحب کے ساتھ پریکٹس شروع کی۔ شاید ڈاکٹر وحید احمد صاحب کا پہلے سے ہی خیال تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان جائیں تاکہ اس کے بعد وہ والد صاحب کی پریکٹس کو زیادہ وسیع پیمانے پر چلا سکیں لیکن شادی کے بعد اس خواہش کے پورا ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب ان کے ماموں تھے۔ اور ووکنگ مسلم مشن کے بانی ہونے کی حیثیت سے اور پھر اس مشن کی اسلامی خدمات کا چرچا دن رات سنتے اور پڑھتے رہنے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے دل میں مسجد کا تقدس اور اس کا احترام ہر لاہوری احمدی کی طرح جاگزیں تھا۔ اگر کسی احمدی کو بھی انگلستان جانے کا موقع ملتا تو اس کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہوتی کہ وہ سب سے پہلے مسجد ووکنگ میں جا کر دو نفل ادا کرے۔ چنانچہ بقول ڈاکٹر وحید احمد صاحب لندن پہنچ کر ان کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ سب سے پہلے جا کر ووکنگ مسجد میں دو نفل ادا کریں۔ کہتے تھے کہ میرے ذہن میں تھا کہ ووکنگ کی شاہجہان مسجد کوئی بہت بڑی مسجد ہوگی کیونکہ عیدین کے موقع پر ایک دنیا وہاں آتی۔ بڑے بڑے خیمے لگائے جاتے۔ بعض اوقات لوگوں کی تعداد تین سے چار ہزار تک پہنچ جاتی اور ان سب کو کھانا بھی کھلایا جاتا۔ اس کے علاوہ گاہے بہ گاہے مختلف مسلمان ممالک کے سربراہان اور وفود اس مسجد کو دیکھنے آتے اور پھر ان کی تصاویر ماہنامہ ''اسلامک ریویو'' میں شائع ہوتیں۔

لیکن ڈاکٹر غلام محمد صاحب کی اچانک وفات ہوگئی اور ڈاکٹر وحید احمد صاحب کو چند مہینے بعد ہی واپس پاکستان آنا پڑا۔ انہوں نے والد مرحوم کی پریکٹس کو سنبھالا اور ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد صاحب نے فارمیسی کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

ڈاکٹر وحید احمد صاحب نہایت شریف النفس، غریب پرور، خوش طبع اور ہمدرد انسان تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شہرت اور شفا دونوں عطا کیں تھیں۔ پنجاب کے کئی ایک ممتاز سیاسی اور کاروباری خاندانوں کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ دوائی ساز کمپنیوں کی طرف سے دی جانے والی نمونہ کی دوائیوں سے ناجائز آمدن کمانے کی بجائے وہ یہ دوائیاں غریبوں، جماعت کے احباب اور دوستوں کو دے دیتے۔ بے وقت فون کرنے یا کلینک میں جانے پر کسی مریض کے لئے بھی ان کی تیوری پر بل نہ آتا بلکہ ایسے اور دیگر مریضوں کو مزاح، حوصلہ افزا باتیں کر کے ان کی آدھی بیماری تو اسی طرح دور کر دیتے۔ اپنے والد مرحوم کی نیک نامی اور شفا کی شہرت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ کئی لحاظ سے اس میں اضافہ کیا۔ خاندان کی دیگر ذمہ داریوں کو بھی بڑی خندہ پیشانی، بردباری اور صبر و تحمل سے ادا کرتے رہے۔

ان کی نیکی اور دینداری کی تفصیل میں جانے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ صرف ایک دو باتوں کا ذکر کرتا چلوں تاکہ قارئین کو ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے بھی آگاہی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی میں نماز جمعہ میں شامل ہونے میں سستی کرتا ہوں تو مجھے کوئی نہ کوئی نقصان ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جب بھی میں اللہ کی راہ میں یا دینی کاموں کے لئے چندہ دیتا ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے ہمیشہ اس کا دوگنا عطا کرتا ہے۔ اب یہ تو ایک نیک سوچ کی بات ہے ورنہ ڈاکٹر کو تو وقت بے وقت مریض بلاتے ہی ہیں اور فیس تو ان کو ملنی ہی ہوتی ہے۔

سالانہ دعائیہ کے موقع پر تین چار دن کھانے کے تمام تر انتظامات ڈاکٹر صاحب کے ذمہ ہوتے تھے۔ لوگوں کی خدمت اس جذبہ اور خندہ پیشانی سے کرتے کہ لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ یہ ڈاکٹر ہیں یا کارکنوں میں سے ایک کارکن۔ کبھی پرات لے کر دوڑے جا رہے ہیں اور کبھی گرم گرم روٹیاں تندور سے لا کر لوگوں کو دے رہے ہیں۔ اور اس بھاگ دوڑ میں لوگوں کی باتیں بھی سن رہے ہوتے لیکن چہرے پر مسکراہٹ بدستور قائم رہتی۔

کئی سال تک مقامی جماعت احمدیہ، لاہور کے صدر رہے۔ اپنی کار میں خود، ورجینیا بھابی، میں اور میری مرحومہ بیوی سلمیٰ ماڈل ٹاؤن اور دیگر جگہوں پر جا کر سیلاب زدگان اور دیگر مواقع پر لوگوں سے چندہ اکٹھا کرتے۔ کلینک اور گھر پر نوکروں سے نرم رویہ اور خاموشی سے ان کی امداد کرنا قابل رشک تھا۔ جب پہلی بار مقامی جماعت کے صدر منتخب ہوئے تو میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اب تو آپ کو کبھی کبھی چھوٹی موٹی تقریر کرنی یا کچھ بولنا پڑے گا۔ فرمانے لگے: بھائی! میں تو گھر میں نہیں بولتا تو باہر کیا بولوں گا۔ جب کبھی بھی ان سے بحیثیت مریض یا کسی کام سے ملنے گیا کبھی ان کے چہرے پر تھکاوٹ یا بے زاری کے آثار نہ دیکھے۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد صاحب اکٹھے کار میں کلینک آتے اور اکٹھے ہی واپس جاتے۔ ہم نے ہر جگہ ان کو اکٹھے ہی دیکھا۔ دوستی، نیکی اور خوش خلقی کا یہ جوڑا ہم سب کے لئے اور ہر ایک کے لئے ہمہ تن انکساری اور انسان دوستی کا پیکر تھا۔ ورجینیا بھابی اور ذرینہ بھابی دونوں نے اس رفاقت کو مضبوط اور پروان چڑھانے میں تحمل اور انکساری کا عملی نمونہ دکھایا۔ ایک مرتبہ کسی نے ذرینہ بھابی سے پوچھا آپ کے خاوند کیا کرتے ہیں تو برجستہ جواب دیا کہ وہ دوائیاں تقسیم کرتے ہیں۔

پنجاب کے کیمیکل ایگزامینر کا عہدہ ایک نہایت ہی اہم اور مشکل کام ہے۔ ایک مدت تک اس حساس عہدہ پر لاہوری احمدی یکے بعد دیگرے فائز رہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر سید محمد طفیل حسین شاہ صاحب اس عہدہ پر تھے۔ جب بھی حضرت اقدس لاہور آتے یا ڈاکٹر صاحب کو قادیان جانے کا موقع ملتا تو عقیدت اور محبت کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر صاحب موقع ڈھونڈھ کر ان کے پاؤں دباتے اور دعا کے لئے درخواست کرتے۔ ایک بار حضرت اقدس نے فرمایا: انشاء اللہ اللہ تعالیٰ تمہارے علاج میں شفا اور فضل عطا کرے گا۔

ڈاکٹر سید محمد طفیل حسین شاہ صاحب تاحیات مرکزی انجمن احمدیہ، لاہور کے خزانچی رہے۔ بھاٹی گیٹ کے باہر ان کے کلینک میں مریضوں کی بھیڑ رہتی اور وہ ان کو گھیرا ڈالے رکھتے اور حضرت ڈاکٹر صاحب نسخے پر نسخہ لکھ کر دیتے رہتے۔ لوگ اس نیک اور ہمدرد ڈاکٹر کے علاج اور اس کی دعاؤں سے شفا پاتے۔ ان کے کیمیکل ایگزامینر کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے بعد محترم و مکرم ڈاکٹر اللہ بخش صاحب جو حضرت مولانا عزیز بخش صاحب کے بڑے صاحبزادے اور حضرت مولانا محمد علی صاحب کے بھتیجے تھے وہ کیمیکل ایگزامینر بنے۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر ملک نذیر احمد صاحب کیمیکل ایگزامینر کے عہدہ جلیلہ پر آ گئے۔ ان ڈاکٹر صاحبان نے دیانت داری اور فرض شناسی کی شاندار مثالیں قائم کیں جو آج تک زبان زد عام ہیں۔ ہمارے عزیز بھائی اور حضرت ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے رشید احمد صاحب کی شادی ڈاکٹر ملک نذیر احمد صاحب کی بیٹی ذرینہ احمد سے ہوئی۔ ذرینہ بھابی کے چہرہ پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی ہے اور ان کو رشید بھائی کی طرح مختلف لذیذ کھانے اور پکوان بنانے اور لوگوں کو کھلانے کا خوب سلیقہ ہے۔

رشید بھائی کے عزیز رشتہ داروں اور دوستوں سے تعلقات کو انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے نبھایا۔ رشید بھائی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ حد درجے کا تھا۔ جب کبھی دوائی لینے ان کے پاس ہم میں سے کوئی جاتا تو بل بنانے سے پہلے کاغذ پر حساب کتاب کرنے لگتے۔ یعنی کمپنی سے جو کمشن فارمیسی کو ملتا اس کو اصل قیمت میں سے نکال کر اس رقم کو ہم سے لیتے۔

سرینام کے محمد فاضل رمضان صاحب سے مل کر مہارانی ٹیلرز کے نام سے مال روڈ پر دوستی کا کاروبار شروع کیا۔ رشید بھائی نے اس کے ذریعے اور پھر بعد میں بھی اپنی ڈیزائننگ اور آرٹسٹک ذوق کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ یہ کاروبار دوستی زیادہ اور کاروبار کم تھا۔ لیکن ہم لوگوں کو اس سے خوب فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر وحید احمد صاحب کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ڈاکٹر بنے لیکن وہ ایک بین الاقوامی شہرت کا کپڑوں کا ڈیزائنر بن گیا۔ ادھر رشید بھائی جو مزاج کے لحاظ سے کپڑوں کے بہترین ڈیزائنر، آرٹسٹ اور کچھ کچھ شاعر بھی تھے ان کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔ والدین کی تمنائیں اور اولاد کی راہیں کیا شکل اختیار کرتی ہیں۔ اس کا علم تو خدا کو ہی ہے۔

مجھے ابھی تک یاد ہے کہ رشید بھائی نے میری شادی کے موقع پر نیلے رنگ کی ایک ساڑھی پر سفید موتیوں اور تلے سے اتنا خوبصورت ڈیزائن بنایا کہ میری رفیقہ حیات سلمٰی مرحومہ اس کو اکثر پہنا کرتی تھیں اور جب ساڑھی کا کپڑا خراب ہونے لگا تو اس کی قمیص بنالی گئی۔ لیکن اس صورت میں بھی ڈیزائن کی خوبصورتی اور دلکشی قائم رہی۔

دونوں بھائی ہمارے معمولی سے گھر میں بمع اپنی بیگمات کے بلاتکلف دعوت میں شریک ہوتے۔ افسوس ان دونوں نفیس اور بے لوث بھائیوں کی طرح دوستوں کو آخری کندھا نہ دے سکا۔ رشید بھائی کی انتقال کی خبر انگلستان میں سن کر پرانی یادیں اور ان دونوں بھائیوں کی شفقت اور دوست داری نے دل کو بے قرار کر دیا۔ لیکن فاصلوں کی دیوار حائل تھی اور اظہار تعزیت کے لئے ایک ہی طریق ممکن تھا کہ مہکتے ہوئے پھولوں کا ہالہ اور ان کے درمیان سمٹے ہوئے چند تعزیتی الفاظ نے قبر کی مٹی سے چپک کر ایک دورافتادا بھائی کی مغفرت کی دعائیں ان تک پہنچایں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں نیک روحوں کو تاقیامت اپنے سایہ رحمت میں رکھے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆☆

بچوں کا سال

جیسا کہ احباب کو علم ہے کہ حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ نے یہ سال ''بچوں کا سال'' قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں بچوں کو پانچ وقت کی نمازوں کی پابندی کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔ جامع دارالسلام، لاہور میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ہر نماز میں بچوں کی حاضری لگتی ہے۔ ماہ مارچ میں جن بچوں اور بچیوں نے سب سے زیادہ باقاعدگی سے پانچوں نمازوں اور دیگر تقریبات میں شرکت کی ان کے نام حسب ذیل ہیں:

اول: عالیہ ابرار

دوم: درِ شہوار احمد

سوم: شگفتہ احمد

چہارم: سکندر احمد، مظفر احمد

پنجم: مصطفیٰ

ان بچوں اور بچیوں کو حضرت امیر ایدہ اللہ شبان الاحمدیہ مرکزیہ، لاہور کی طرف سے منعقدہ تقریب ''یوم مسیح موعودؑ'' کے موقع پر انعامات دیں گے۔

سیکرٹری

شبان الاحمدیہ مرکزیہ

کوئز اطفال الاحمدیہ

۱۔ ہجرت مدینہ کے وقت حضور صلعم کے ساتھ کونسے صحابی تھے؟

۲۔ مسجد نبوی میں سب سے پہلی اذان کس نے دی؟

۳۔ مسلمانوں کی روزمرہ کی فرض عبادت کا نام بتائیں؟

۴۔ نماز میں جھک کر اللہ کی تسبیح کرنے کو کیا کہتے ہیں؟

۵۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے جو نماز پڑھتے ہیں اس کا کیا نام؟

نوٹ: ان سوالات کے جوابات بچے اپنے ہاتھ سے لکھ کر سیکرٹری شبان الاحمدیہ (ہارون جاوید) کو جلد از جلد جمع کروائیں۔

انگریزی سے ترجمہ : اویس عامر

جب مسلمان کا زبانی وعدہ ہی مقدس دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۲

از حضرت مولانا محمد یعقوب خان صاحب

یہ وہ سنہری زمانہ تھا جب حضرت عمرؓ مدینہ میں اسلامی خلیفہ کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔ اُن کے بلا روعائیت عدل وانصاف کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ امیر، غریب اور نہ ہی دوست اور دُشمن کو چھوڑتے تھے۔ جب اُن کے اپنے بیٹے کا جرم ثابت ہوگیا تو اُس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ ایسی عدالت کے سامنے شیخ نے اس نوجوان کو پیش کیا۔ بوڑھے مقتول کے دو بیٹے بھی اُس کے ساتھ تھے۔ ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے بعد مدعی اور مجرم دونوں اسلام کے دارالخلافہ پہنچے اور مقدمہ خلیفہ وقت کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کی عدالت اُس وقت کی عام عدالتوں کی طرح شان وشوکت اور ظاہری رسم وآداب نہ رکھتی تھی۔ جہاں لوگوں کو کم ہی انصاف ملتا تھا۔ اسلام کے اس سنہری دور میں سادگی ایک نمایاں خصوصیت ہوتی تھی۔ خلیفہ وقت کی عدالت گھاس پھوس کی بنی ہوئی مسجد سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ جج نے نہ بالوں والی وگ، ٹوپی یا کوئی لمبا کوٹ پہنا ہوتا تھا۔ جلیل القدر خلیفہ وقت پیوند لگے ہوئے لیکن صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک بینچ پر بیٹھے ہوتے جو کھجور کی چٹائی سے بنی ہوئی ہوتی۔ ملزم اُن کو دیکھتے ہی تھر تھر کانپنے لگتا تھا۔ اُن کا سخت گیر انصاف کمزوروں کا محافظ اور ظالموں کیلئے دہشت تھا۔ جج کی طرح جیوری بھی اُسی طرح سادہ ہوتی۔ یہ عدالت اُن پاکیزہ اور نیک مسلمانوں پر مشتمل ہوتی جو نماز ادا کرنے آئے ہوتے۔ یہ تمام لوگ خدا خوف، انصاف پسند اور معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرنے والے تھے۔ وہ نوجوان جس پر شیخ کے باغ کے مالی کے قتل کرنے کا الزام تھا اُس کو اسی منصف اور جیوری کے سامنے پیش کیا گیا۔ مدعی کے بڑے بھائی نے کہا: امیر المومنین! یہ آدمی ہمارے نخلستان میں آرام کیلئے رُکا۔ جب یہ آرام کر رہا تھا تو اُس کا اونٹ ہمارے شیخ کے باغ میں گھس آیا اور اُس نے انگوروں کے باغ کو بہت نقصان پہنچایا۔ ہمارے والد نے اس جانور کو دو دفعہ مار بھگایا مگر وہ ہر بار پھر اندر گھس آتا۔ تیسری دفعہ ڈنڈا جانور کے نازک حصّہ پر لگا اور وہ مر گیا۔ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا۔ میرے والد کا اُس کو نقصان پہنچانے کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا وہ تو اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ اور شیخ اسی کام کیلئے اُن کو تنخواہ دیتا تھا۔ اس سب واقعہ کے دوران یہ نوجوان مسافر سو رہا تھا اور اُس کو اس ساری واردات کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔

میرے والد بھی اگر چاہتے تو اس واقعہ سے انکار کر سکتے تھے کیونکہ اس واقعہ کا کوئی اور گواہ نہ تھا۔ لیکن وہ ایک سچے مسلمان اور پیغمبر خداؐ کے سچے پیروکار تھے۔ اُنہوں نے جھوٹ بول کر رسول اکرم ﷺ اور اسلام کا نام بدنام نہ کرنا چاہا۔ وہ ہمیں اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک مسلمان کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے، چاہے جیسے بھی حالات ہوں۔ وہ ہمیں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ سچائی حضور اکرم ﷺ کے کردار میں چمکتا ہوا ایک نگینہ تھا۔ وہ دعویٰ نبوت سے پہلے بھی ''الامین'' یعنی انتہائی ایماندار اور قابل اعتماد شخص کے لقب سے مشہور تھے۔ ایسا آدمی جس میں اسلامی تعلیمات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو وہ کیوں کر ادنیٰ سی جان بچانے کیلئے یہ ذلیل حرکت کرا اور جھوٹ بول سکتا تھا۔ وہ اُس نوجوان مسافر کے پاس آئے اور نہایت نرمی سے سارا واقعہ بیان کیا اور دُکھ کا اظہار کیا۔ لیکن وہ نوجوان اُن کے اس اسلامی شعار کے مطابق اعتراف کو سراہنے کی بجائے ہمارے بزرگ والد کی طرف لپکا، گلے سے پکڑا اور مار ڈالا۔ جب بوڑھے مالی کے بیٹے نے یہ دُکھ بھری داستان سنائی تو عدالت کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ جج نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: نوجوان! تم اس بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟ جناب! نوجوان نے کہا جس کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا: میں اپنی دفاع میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مجھے اپنی اس حرکت پر دکھ اور شرمندگی ہے۔ جو کچھ میرے ہاتھوں نے کیا مجھے اس بات کی پرواہ نہیں اگر مجھے اس جرم کیلئے جان بھی دینی پڑے جس کیلئے میں یہاں حاضر ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ دُکھ کی بات جو اس وقت میرے ذہن کو پریشان کیے ہوئے ہے یہ ہے کہ میں نے اسلام سے غداری کی ہے۔ اور سچائی سے بھرپور اسلام کی تعلیمات کی خلاف ورزی کی ہے۔ ہمارے پیغمبر اسلامؐ نے خاص طور پر زور دیا تھا کہ ہمیں بوڑھوں کی عزت کرنی چاہیے۔ اُنہوںؐ نے اپنی زندگی کے آخری خطبہ میں اسلام کی تعلیمات کی اس خصوصیت پر زور دیا تھا کہ ایک انسان کی زندگی، جائیداد، عزت، مال دوسرے انسان کیلئے محترم بنا دیئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے جو کچھ کیا وہ ان تعلیمات کے خلاف ہے اور میں نے ایک بوڑھے شخص کی عزت کرنے کی بجائے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا اور اُس کی جان لے لی۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میں قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اپنے جرم

کا اعتراف کروں۔

مسجد میں موجود تمام حاضرین نوجوان کے اس دلیرانہ اعتراف سے بہت متاثر ہوئے اور اُن سب نے اُس کی بے حد تعریف کی کہ موت کے منہ میں بھی اُس نوجوان نے اسلامی حوصلہ دکھایا اور سچ بولا۔ خلیفۂ وقت نے بھی کہا! شاباش میرے بچے یہی وہ طریق ہے جو ایک مسلمان کو اپنانا چاہئے۔ برے اعمال پر شرمندہ ہونا اور توبہ کرنے میں کبھی بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بے شک تم ایک قاتل ہو لیکن میں سچائی کے اس اعلیٰ جذبہ پر تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اسلام اپنے ہر فرزند سے یہی توقع رکھتا ہے۔ اگر موت کا بھی اس کو سامنا ہو تو ایک مسلمان کو اتنا بھی ذلیل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ جھوٹ بولے۔ ایسا شخص بزدل ہوتا ہے جو نتائج سے ڈر کر جھوٹ بولتا ہے۔ مسلمان کیسا بھی ہو وہ کبھی بھی اس معاملے میں بزدل نہیں ہوتا۔ خوف کا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ تم نے اس نازک موقع پر بھی اسلام کے ایک قابل فخر فرزند کی طرح عمل کیا۔ لیکن مجھے بہت دُکھ ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ قانون کا تقاضا ہے کہ تمہیں جُرم کی سزا کے طور پر مرنا ہوگا۔ ''اے امیر المومنین'' نوجوان نے پھر کہا: آپؓ کو دُکھ نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے آگے سر جُھکا دے۔ اگر اُس کی یہی رضا ہے کہ میں مروں تو میں اُس کی رضا کو خوشی سے تسلیم کرتا ہوں۔ میری بس ایک آخری التجا ہے کہ مجھے گھر کے کچھ ادھار چکانے ہیں اور اس بات نے میرے ذہن کو پریشان کیا ہوا ہے۔ میں اللہ کو کیسے منہ دکھاؤں گا کہ میں نے اپنے ہی بندوں کے حقوق ادا نہیں کیئے؟ چاہے میں ایک قاتل ہی ہوں لیکن اپنے آپ کو بددیانت نہیں کہلوانا چاہتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی جب موت قریب تھی تو اُن کے ذہن میں بھی ایک پریشانی تھی جس کا انہوں نے بڑے واضح انداز میں اظہار کیا اور لوگوں سے پوچھا: اگر میں نے کسی کا کچھ ادھار دینا ہو تو بتائے تاکہ میں اُسے ادا کر سکوں۔ اُنہوںؐ نے یہ بھی پوچھا اگر انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو تو وہ بھی بتائے تاکہ میں اُس کا ازالہ کر سکوں۔ اور وہ چاہتے تھے کہ چونکہ موت کا وقت قریب ہے اس لئے وہ اس دُنیا سے اچھے اوصاف اعمال کے ساتھ رخصت ہوں۔ انہوںؐ نے فرمایا: خدا کے سامنے شرمندگی اٹھانے سے بہتر ہے کہ بندہ انسانوں کے سامنے شرمندہ ہو جائے۔ اُس نوجوان نے کہا: میں اسلام کی پاکیزہ اور نیک نامی پر بدنما داغ نہیں بننا چاہتا کہ میں اس دنیا سے اُس حالت میں رخصت ہوں کہ میں نے ابھی کسی کا اُدھار ادا کرنا تھا۔ اے امیر المومنین! مجھے اتنی مہلت دی جائے کہ میں گھر جا سکوں اور اس اُدھار کو ادا کر سکوں۔ میری صرف یہی ایک اور آخری خواہش ہے۔ پوری عدالت اور خلیفۂ وقت اس نوجوان کی اس دلیرانہ ایمانداری پر خوش ہوئے۔ اور سب نے بہ یک زبان کہا کہ اس نوجوان نے موت کو دیکھ کر بھی اُس کے دل کو صرف یہی ایک جذبہ پریشان کیے ہوئے ہے کہ اُس نے لوگوں کا حق ادا کرنا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اسلام کے ایک ایسے قیمتی بیٹے کو مرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس سے بچنے کا کوئی طریق بھی تو نہ تھا۔ قانون کسی شخص کی پرواہ نہیں کرتا۔ جرم کی وجہ سے اُس کو مرنا ضرور ہے۔ لیکن ہر کسی کی یہ خواہش تھی کہ اُس کی آخری التجا کو ضرور مان لیا جائے۔ خلیفۂ وقت نے اعلان کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ تمہاری خواہش پوری کی جاتی ہے۔ لیکن تمہیں اپنی ضمانت کیلئے کسی کو پیش کرنا ہوگا جو اس بات کی ذمہ داری اٹھائے کہ تم مقررہ وقت پر واپس آ جاؤ گے۔ امیر المومنین! نوجوان نے کہا: میرے الفاظ ہی میری ضمانت ہیں جو اس وقت میں دے سکتا ہوں اور مسلمان اپنے الفاظ کا ہر حال میں پاس رکھتا ہے۔ خلیفہ وقت نے کہا تم ٹھیک کہتے ہو۔ اسلام اپنے ہر بیٹے سے یہی توقع رکھتا ہے کہ اُس کو اپنے الفاظ کا پابند ہونا چاہیے، چاہے اُس کی قیمت اس کو اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑے۔ لیکن انصاف کا یہ بھی تقاضا ہے کہ قانون کے تقاضے کو پورا کیا جائے اور قانون کی نظر میں الفاظ ضمانت نہیں ہو سکتے۔ تمہیں کسی شخص کو پیش کرنا پڑے گا جو تمہاری ضمانت دے سکے۔

اس بات نے نوجوان کو نہایت افسردہ کر دیا۔ وہ اس جگہ اجنبی تھا۔ کون اس کی ضمانت دے سکتا تھا اور ایک اجنبی کی ضمانت دے کر اپنی جان کو خطرہ میں ڈالتا۔ اس کو کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ اب کیا کرے۔ یہ ایک انتہائی نازک معاملہ تھا۔ اگر وہ وقت مقررہ پر واپس نہ پہنچ سکا تو ضامن کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ ان حالات میں ایک اجنبی کو ایسی امید کرنا کہ کوئی اس کی ضمانت دے بڑی دور کی بات تھی۔ اس نے نا امیدی سے ایک دفعہ پورے مجمع پر ایک نظر ڈالی لیکن اس کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ کسی ایک کو بھی ضمانت کے لئے کہہ سکے۔ اسے علم تھا کہ ایسا کہنا بڑی زیادتی ہوگی۔

نوجوان پریشان کھڑا تھا اور اس پر افسردگی اور نا امیدی چھائی ہوئی تھی۔ عین اس وقت مسجد کے ایک کونے سے ایک بوڑھا شخص کھڑا ہوا جس نے اعلان کیا۔ اے امیر المومنین! میں اس نوجوان کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس اعلان سے تمام مجمع میں خوشی اور حیرانگی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ غیر معمولی جرأت اور ہمدردی کا پیکر شخص حضرت ابوذر غفاریؓ تھے جو رسول اکرم ﷺ کے معروف صحابی تھے۔ نوجوان کو اسی وقت قید سے آزاد کر دیا گیا جس نے وعدہ کیا کہ وہ وقت پر قتل کی سزا بھگتنے کے لئے واپس آ جائے گا۔ (ماخوذ از ''گولڈن ڈیڈز آف اسلام'')

والدین کی تمنائیں، کوششیں: بچوں کی سوچ اور زندگی کا سفر

ارشاد عرشی ملک، اسلام آباد

جب میں اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھا
میرے ابو جانی مجھ کو بے حد پیارے لگتے تھے
میری سوچوں کے آکاش پہ روشن تارے لگتے تھے
بے حد عظمت کے مالک اور بے حد اچھے لگتے تھے
دنیا کا کچھ علم نہیں، پر ابو سچے لگتے تھے۔

چھ سالوں کا ہو کر میں نے جان لیا
میرے ابو سارے علم کے مالک ہیں
ہر پل ہنستا، روشن چہرہ، کتنے حلم کے مالک ہیں۔

جب میں اپنی عمر کے دسویں سال میں پہنچا
مجھے لگا کہ یوں تو ابو اچھے ہیں
پر مجھ سے غصے رہتے ہیں
ان کا علم و فہم بھی گرچہ اچھا ہے، پر خاص نہیں ہے
میرے ہر ساتھی کے ابو، اتنے علم کے مالک ہیں

بارہ سال کا ہو کر میں کچھ بے کل سا تھا
ہر پل سوچا کرتا تھا
ابو کو خوش کرنا کتنا مشکل ہے
جب میں چھوٹا بچہ تھا، تو ابو مجھ سے کتنا پیار کیا کرتے تھے
گود میں مجھ کو لے کر چاہت کا اظہار کیا کرتے تھے
تب وہ کتنے اچھے تھے۔

سولہ سال کا ہو کر یک دم میں کافی مایوس ہوا تھا
ابو یوں تو ٹھیک ہی ہیں، پر وقت کا ساتھ نہیں دے پاتے
اکثر ہیں پیچھے رہ جاتے۔
سترہ سال سے بیس برس کی مدت کافی مشکل تھی
مجھ کو یوں لگتا تھا جیسے، ہر پل مجھ پر نکتہ چینی

ابو کی اب عادت بنتی جاتی ہے
میری ٹوہ میں رہنا ان کی فطرت بنتی جاتی ہے
میرے ملنے والوں سے بھی اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں
مجھ سے کچھ مایوس سے ہیں اور بگڑے بگڑے رہتے ہیں
تب میں ان کی نظروں سے بچ بچ کے گزرا کرتا تھا
اور یہ سوچا کرتا تھا
ان کی صحبت میں کچھ دیر بھی رہنا کتنا مشکل ہے
ان کی گہری گہری نظریں سہنا کتنا مشکل ہے
جانے ماں کس طرح ان کا ساتھ نبھاتی آئی ہے

چوبیس اور پچیس برس کی عمر میں مجھ کو یوں لگتا تھا
ان کو میری ہر خواہش سے بیر سا ہے
دنیا کے حالات کا بھی کچھ علم نہیں ہے
طیش میں جلدی آجاتے ہیں
شاید ان میں حلم نہیں ہے
جانے دنیا والوں کا وہ ساتھ نبھانا کب سیکھیں گے
آنے والے نئے دنوں سے، ہاتھ ملانا کب سیکھیں گے

تیس برس کا ہو کر میں حیران ہوا کہ
اپنے ننھے بچوں کو کس طور سنبھالوں
ایک نہیں وہ سنتے میری
حالانکہ میں چھوٹے ہوتے اپنے ابو سے ڈرتا تھا
جو کچھ وہ کہتے کرتا تھا
چالیس اور پینتالیس سال کا ہو کر آخر میں نے جانا
ابو نے ہم سب کو کافی طور اطوار سکھائے تھے
خوب ڈسپلن میں رکھا تھا
میں حیران ہوا کہ ابو اتنے بچوں کو کیسے

اک نظم و ضبط میں رکھتے تھے۔

نصف صدی کی عمر بتا کر میں نے جانا
بے شک ابو نے ہم سب پر کافی وقت لگایا تھا
روز و شب قربانی دی تھی، سارا مال لٹایا تھا
چھ بچوں کو نظم و ضبط سکھانا اور پروان چڑھانا
کام کوئی آسان نہیں تھا۔
میرے دو بچے ہیں وہ بھی اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں
اور جنریشن گیپ کے ان کے لب پر دکھڑے رہتے ہیں

پچپن سال کی عمر میں مجھ پر اور بہت سے راز کھلے
بے شک ابو اعلیٰ ظرف کے تھے
متحمل تھے، دانشور تھے
دور تلک وہ دیکھ رہے تھے، دیدہ ور تھے
وہ ہر کام کو مجھ سے بڑھ کر احسن طور پہ کر سکتے تھے
کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔

اب میں ساٹھ برس کا ہو کر
چوٹ پہ ڈنکے کی کہتا ہوں
میرے ابو جانی مجھ کو جان سے پیارے لگتے ہیں
میری سوچوں کے آکاش پہ روشن تارے لگتے ہیں
بے حد عظمت کے مالک اور بے حد اچھے لگتے ہیں
دنیا کا کچھ علم نہیں، پر ابو سچے لگتے ہیں۔

چار برس کی عمر میں جو ایمان تھا میرا
ساٹھ برس کی عمر میں عرشی وہ ایمان ہوا ہے تازہ
ابو کی قدر و قیمت کا آج ہوا مجھ کو اندازہ۔

(ماخوذ از ماہنامہ "اقدار ملت" مارچ 2010ء، اسلام آباد ص 27)

باہتمام پاکستان پرنٹنگ ورکس کچا رشید روڈ لاہور سے چھپوا کر پبلشر چوہدری ریاض احمد صاحب نے دفتر پیغام صلح، دار السلام۔ 5۔ عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور سے شائع کیا۔

حضرت امیرایدہ اللہ محترم عبیداللہ بٹ صاحب کو ''بیان القرآن'' لائبریری ایڈیشن کا سیٹ پیش کررہے ہیں۔محترم بٹ صاحب اوران کے خاندان کے افراد نے اس ایڈیشن کے اخراجات کے لئے عطیہ جات مرحمت فرمائے

محترم عبدالسنتو صاحب روٹرڈیم، ہالینڈ ''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر سلائڈز کے ذریعے لیکچر دینے سے پہلے حضرت امیرایدہ اللہ کے ساتھ